وفات النبی ﷺ

مولانا حافظ احمد حسین صاحب قاسمی الدہلوی

خطیب مدرسہ حسین بخش جامع مسجد دہلی

وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وفات کی ابتداء سے
وفات تک کے مستند حالات کا بہترین مجموعہ
جسمیں بیماری اور وفات کی دردناک کیفیات أثناء مرض
میں واقع ہونیوالے تمام ہدایت آموز واقعات اور آپ کی
آخری وصیتوں کو نہایت محققانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے

تالیف

مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی خطیب مدرسہ حسین بخش جامع مسجد دہلی

ناشر
کتب خانہ انعامیہ دریبہ کلاں دہلی

فہرست مضامین

(مطبوعہ ہمدرد بھائی پریس، دہلی)

دیباچہ

دہلی کے ایک ایسے محلہ میں جہاں علماء حق کا وعظ سننا تو درکنار ان کا داخلہ بھی ناپسند سمجھا جاتا ہے اتفاق سے مجھے ایک مرتبہ تقریر کرنے کا موقعہ مل گیا، میں نے اثنائے وعظ میں نماز کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بیان کی جس میں ہے "______حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی تاکید فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ پر غرغرہ کی حالت طاری ہوگئی" ______گو میں نے اپنی تقریر میں اختلافی اور نزاعی مسائل بیان کرنے سے گریز کیا اور وہی باتیں بیان کیں جن پر دین کی اصل بنیاد قائم ہے، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ سنا کہ محلہ کے تمام مسلمانوں میں میرے خلاف سخت ناراضگی پھیلی ہوئی ہے اور مجھ پر کفر کا فتوے لگایا جا رہا ہے کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب "غرغرہ" کی نسبت کر کے بڑی زبردست گستاخی کا ارتکاب کیا ہے۔

اور سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہوا کہ دہلی کے بعض ...... علماء بدعت نے ان لوگوں کے پوچھنے پر انھیں جواب دیا کہ ——— "ہم پہلے ہی کہتے ہیں کہ دیوبندیوں کو نہ بلایا کرو ———" اختلافات مذہبی ہوں یا سیاسی وہ وہ اپنی جگہ رہے ہے مگر جوشِ تعصب میں دین کے مسلّمات پر بھی اہلِ حق کو مطعون کرنا اور عوام کو صحیح بات سے باخبر کرکے ان کی غلط فہمی دور کرنا آخر کہاں کی ایمانداری ہے ———؟ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کیا کہ میں آنے والے ماہ ربیع الاول میں جہاں کہیں میلاد پاک یا سیرت مقدسہ پر تقریر کرنے کا موقعہ پاؤں گا اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات، مرضِ وفات، اور اس کی دردناک کیفیات ضرور بیان کروں گا۔

اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ مسلمانوں کے ذہن سے وہ "مافوق البشریت" تصورات نکل جائیں گے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے متعلق ان مبتدعین نے پھیلا رکھے ہیں اور یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق "انسانی باتیں" سن کر بدکنا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چھوڑ دیں گے، اور پھر کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ صاحب

ربیع الاول جیسے مقدس مہینہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کیا ـــــ؟ ـــــ میں کہہ سکوں گا کہ ماہ ربیع الاول جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کا مہینہ ہے اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا مہینہ بھی ہے، اس مناسبت سے اگر دوسروں کو اس ماہ میں ولادت کے مسرور کن واقعات بیان کرنے کا حق ہے تو مجھے وفات رسول ؐ کے دردانگیز حالات بیان کرنے کا بھی مجاز ہونا چاہئے

ربیع الاول ۱۹۴۶ء میں میں نے ایسا ہی کیا، اور خاص طور پر مدرسہ حسین بخش (مٹیا محل جامع مسجد) میں مسلسل کئی جمعوں تک اسی موضوع پر تقریریں کیں، جو علماء دہلی کے مواعظ حسنہ کا قدیم مرکز ہے، اور جس میں قدیم معمول کے مطابق دہلی کے تمام علاقوں کے مسلمانوں کا اچھا خاصا اجتماع ہوتا ہے۔

جب تقریروں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو بعض واجب الاحترام بزرگوں نے اصرار کیا کہ ان تقریروں کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

عام استفادہ کے پیش نظر میں نے اس تجویز کو پسند کیا اور اور ان پر نظر ثانی کر کے شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پیش نظر کتاب انہی تقریروں کا مجموعہ ہے، اس کتاب کے

متعلق میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ میں نہ ادیب ہوں نہ محقق، بلا تصنع ایک طالب علم ہوں۔ نہ میرا مقصد کوئی علمی یا تحقیقی شاہکار پیش کرنا ہے نہ کوئی دینی کارنامہ ——— صرف اصلاح میرا مطمح نظر ہے۔

پس میں اصحاب علم سے امید کرتا ہوں کہ وہ پیش نظر کتاب پر اسی لحاظ سے نظر ڈالیں گے، اور میری کوتاہیوں سے مجھے آگاہ کر کے مجھے ممنون فرمائیں گے۔

باقی رہا رد و قبول ——— تو میں اس بارے میں کسی انسان کو مختار نہیں سمجھتا۔ اس کے لئے صرف رب حقیقی سے دست بدعا ہوں کہ ——— "اے ذرے کو آفتاب بنانے والے میری اس ناچیز کوشش کو قبول فرما کہ تو جسے قبول فرما لیتا ہے، مجال نہیں کہ اسے کوئی رد کر سکے، الٰہی! میری ریاکاری سے درگزر فرما اور مجھے اپنے دین کی اس حقیر خدمت کے ذریعہ اپنی ذرہ نوازی سے نجات آخرت اور رضوان اکبر کا مستحق بنا دے۔"

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ واشہد ان محمداً
عبدہٗ ورسولہ

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْنْ مَّاتَ
اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ
اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشَّاكِرِيْنَ

بزرگانِ محترم۔ دوستو اور بھائیو!

میلاد کے جلسے وجلوس

یہ مہینہ وہ مقدس مہینہ ہے جس میں حضورِ اکرم سردارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت واقع ہوئی تھی، اس لئے اس مبارک ماہ میں جگہ جگہ اظہارِ مسرت کے طور پر میلاد پاک کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں، اور ان میں حضور کی پیدائش کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں، کون بدنصیب گستاخ ہے جو اس خوشی میں اپنی شرکت کو سعادت مندی اور اس ماہ میں خیر خیرات کو موجب اجر نہ سمجھتا ہوگا

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک کی خوشی منانے کا حق صرف میلاد النبی یا سیرت النبی

کے جلسے منعقد کرنے سے ادا ہو جاتا ہے، اور خدا تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کی یادگار صرف اس طرح منا لینا کافی ہے کہ چند بارونق محفلیں قائم کیں اور ان میں چند موضوع یا مستند روایات سنا دیں۔ ــــــ یا اور آگے بڑھے تو بارہویں ربیع الاول کو جلوس نکال لئے۔ سائیکل سواروں اور اونٹ سواروں کی قطاریں۔ کچھ نعت گو ٹولیاں۔ بینڈ باجے اور نعروں کا شور و غل ــــــ اس قسم کا ایک تماشا سا بنا کر بازاروں میں پھر لئے، ــــــ خدارا یہ تو بتائیے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سراپا عمل وجہاد پیغمبر کی یادگار منانے کا یہ کونسا معقول طریقہ ہے، کیا تم ایمانداری سے بتاؤ گے کہ اگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی سنجیدگی اور وقار کا خداوند تعالیٰ مدّاح ہے تمہاری تعظیم اور محبت کے یہ نمائشی مظاہرے بچشمِ خود دیکھیں تو کیا وہ تم سے خوش ہوں اور تمہیں اس قسم کی خرافات کرنے کی اجازت دیں ــــــ؟

خیر یہ بات تو خود مسلمانوں کے سوچنے کی ہے کہ وہ شافع المذنبین کے سامنے قیامت میں سرخرو ہو کر جانا پسند کرتے ہیں یا سیاہ رو ہو کر، ہم تو اس کے متعلق اگر زیادہ لے دے کریں گے تو خدا جانے مسلمان ہماری ضد میں اور کیا نئی چیز نکال کھڑی کریں گے۔

ہم تو میلاد اور قیام کی مخالفت کر کے دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں نے ہماری ضد میں میلاد کا جلوس ایجاد کر لیا۔ حالانکہ اگر انہیں دعوے محبت ہے تو انہیں یہ احساس کرنا چاہئے کہ جس طرح چھوٹوں کی مخالفت اور خلاف ورزی احکام سے ہمارا دل دکھتا ہے اور ہمیں رنج ہوتا ہے اسی طرح سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے آپ کو بے حد صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارا ایک ایک عمل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش ہوتا ہے۔

دل دکھنے پر میں ایک تاریخی واقعہ سناتا چلوں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خلاف سنت چلنے سے چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھتا ہے، اس لئے محبت کرنے والا انسان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مرزا بے دل کا واقعہ

مرزا بے دل کا نام آپ نے سنا ہوگا فارسی کے بے بدل شاعر تھے، اور ان کا کلام تصوف و معرفت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ دور دور ان کے کلام کی دھوم تھی، ایک دفعہ ایران کا سفیر دہلی آیا، دربار میں حاضری ہوئی تو بادشاہ نے دربار کے بڑے بڑے لوگوں سے تعارف کرایا۔ ان میں مرزا بے دل بھی تھے، سفیر نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ

سمجھتا تھا کہ بے دل واقعی کوئی "بے دل صوفی" اور اللہ والے ہوں گے، اب جو دیکھا تو ایک ڈاڑھی منڈے رند سامنے موجود ہیں، تعجب کے ساتھ کہا، مرزا بے دل ریش مے خراشد ——— ؟ مرزا بے دل ڈاڑھی منڈواتے ہو؟ حاضر جواب تھے بولے، لیکن دل کسے رانمے خراشد ——— یعنی عام امراء اور بادشاہوں کی طرح کسی کا دل نہیں دکھاتا، یہ سفیر پر ایک طنز تھا لیکن سفیر بھی دانا تھا۔ فوراً کہا ——— "بے جناب رسول اللہ مے خراشد" یعنی ہاں حضور کا دل دکھاتے ہو،

بس کیا تھا۔ مرزا صاحب پر ایک بجلی سی گری، فوراً سر جھکائے ہوئے کھڑے ہو گئے اور تین روز تک مارے صدمے کے نہ کسی سے بولے اور نہ گھر سے باہر نکلے، پھر کسی نے نہ دیکھا کہ مرزا صاحب کی ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے۔

حضرات! ——— عشق و محبت کی بات تو بہت اونچی ہے یہ تو وہ منزل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی، میں ان جاہلوں کو کس طرح سمجھاؤں جو کہتے ہیں ——— "علماء کا راستہ اور ہے اور فقیروں کا اور طریقت کا راستہ شریعت کے راستہ سے الگ ہے" ——— یہ شریعت

کی تعلیم ہے، جس کے متعلق اکابر سلف نے کہا ہے کہ ——
"طریقت اور شریعت میں تفریق کرنے والے کافر ہیں" ——
حضرت شاہ وارث علی صاحب کو کون نہیں جانتا۔ ان کے سلسلہ کے لوگ عام طور پر آپ کو ملیں گے، ان بزرگ کا ایک مقولہ سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

شاہ وارث علی صاحب کا مقولہ

عشق تین حرفوں سے مرکب ہے۔ ع، ش، ق
ع ۔ سے عبادت الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ ق۔ قربانی کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ کہ اپنے نفس کو ذوق وشوق سے قربان کردو۔
ش ۔ عبادت کے تمام شرائط کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔
دوسری بات یہ کہ عاشق کی ابتدا میں ۔ ع ۔ ہے اور شرع کے آخر میں ۔ع ۔ ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک شرع کے تمام درجات کی تکمیل نہ ہو گی عشق الٰہی ادھورا رہے گا"۔
بتلائیے آپ کہاں ہیں۔ اور یہ شریعت اور طریقت والے کیا کہہ رہے ہیں۔
اگر ان جاھلوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے جو عشق کے پردے میں تمام خرافات کا ارتکاب کرتے ہیں تو یقین جانیئے ان

علمار کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوتی جو نیابتِ رسول کے مالک کہے جاتے ہیں اور میلاد کی محفلوں کو دین و ایمان قرار دیتے ہیں۔ اگر خانقاہوں میں راگ رنگ ہیں تو ان محفلوں میں پھبتیاں ہیں۔ کفر سازی ہے اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ مجھے آج تک کوئی صاحب یہ نہ سمجھا سکے کہ ربیع الاول میں صرف عید میلادالنبی ہی کیوں منائی جاتی ہے، کیا اسی مہینہ اور انہی تاریخوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی؟

پھر فرمایئے ولادت کی خوشی منانا اور وفات پر محرم برپا نہ کرنا کس فلسفہ کے ماتحت ہے، اگر یہ گناہ نہیں ہے کہ ولادت کی خوشی میں نوبت نقارے۔ باجے اور نفیری کی دھوم دھڑکا ہو تو یہ کیوں کر گناہ ہوسکتا ہے کہ وفات کے غم میں ماتم کیا جائے اور سیاہ کپڑے پہنے جائیں۔؟

اُمّت کی میانہ روی

خدا تعالیٰ کا اس اُمت پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے دین کو ہر پہلو سے اعتدال پر قائم رکھا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ	مسلمانو! ہم نے تمہیں ایک میانہ رو اُمت بنایا ہے تاکہ تم (اپنی اعتدال

عَلَی النَّاس   کی روش سے) لوگوں کے لئے عملی نمونہ بن جاؤ

غور کیجئے! جس مہینہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوتی ہے اسی مہینہ میں وفات ہوتی ہے۔ اور دونوں کی تاریخیں اور دن بھی تقریباً ایک ہیں۔

ابن کثیر نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک اثر مسند احمد کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ——

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیر کے دن پیدا ہوئے پیر ہی کے دن آپ کی وفات ہوئی۔ پیر ہی کے دن نبوت عطا فرمائی گئی" اور پیر ہی کے دن مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی" اور پیر ہی کے دن حجر اسود تعمیر کعبہ کے وقت اپنی جگہ نصب کیا گیا

یہ صرف اس لئے تھا تاکہ "امت وسط" اعتدال کی راہ چھوڑ کر افراط و تفریط میں مبتلا نہ ہو جائے۔

دراصل اسلام نے تو اس امت کو "راہ مستقیم" پر قائم رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اب اگر امت ہی ادھر ادھر بھٹکتی ہے تو اس کی ذمہ داری اس پر ہے، اسلام پر نہیں۔

ولادت اور وفات کا اصولی فرق

اگر خدا تعالےٰ ان حضرات کو اسلام کی

سمجھ دیتا اور ان کے دل میں امت کی موجودہ پستیوں کا احساس ہوتا تو یہ لوگ اتنی بات تو سوچتے کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے ولادت کی کرامتیں بیان کرنا مفید ہے یا وفات کے وقت کی وصیتیں۔

اس موٹی سی بات کو تو آپ میں سے بھی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ولادت اور وفات میں بڑا فرق ہے، ولادت ایک ہونے والے نبی کی ولادت ہے، نبی کی ولادت نہیں، لیکن وفات نبی کی وفات ہے، یعنی ولادت کے وقت آپ منصب نبوت پر سرفراز نہیں تھے، چالیس سال کی عمر میں یہ اعزاز بخشا گیا۔ ہاں۔ وفات کے وقت آپ اس منصب پر فائز تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ وفات کے حالات و واقعات میں امت کے لئے زیادہ ہدایت و اصلاح کا سامان موجود ہوگا۔ بہ مقابلہ واقعات ولادت کے، اور واقعہ بھی یہی ہے۔ آپ آگے چل کر سنیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مرض وفات کی ابتداء سے لے کر آخری سانس تک ہر ہر واقعہ اور ہر ہر وصیت امت کے لئے ہدایت کا ایک مستقل دفتر ہے۔

اعطائے نبوت کا زمانہ

میں نے آپ سے عرض کیا۔ "ولادت ایک پیغمبر کی ولادت نہیں تھی" ــــــ شاید اس مسئلہ میں آپ کو ابھی اطمینان نہ ہوا

ہو گا اچھا دیکھئے۔ سورۃ الم نشرح میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ حق تعالےٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ — اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی

یعنی گو سن شعور ہی سے آپ کے دل میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ موجزن تھا اور ہدایت خلق کی کامل استعداد کا چشمہ اندر ہی اندر موجیں مار رہا تھا لیکن بہر حال آپ کے سامنے زندگی کا کوئی مکمل اور واضح دستور العمل موجود نہ تھا بلکہ آپ اس سے بے خبر تھے جس کی وجہ سے آپ غاروں اور پہاڑوں میں جوش طلب میں مارے مارے پھرتے تھے۔ آخر اللہ تعالےٰ نے زندگی کے انتالیس سال گزرنے کے بعد چالیسویں سال منصب نبوت پر سرفراز فرما کر "دین حق" کی واضح راہیں کھول دیں۔ سورہ شوریٰ رکوع ۵ میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ — آپ کو خبر نہ تھی کہ کتاب و ایمان کیا ہے لیکن ہم جس کو چاہتے ہیں اپنے نور سے راستہ دکھا دیتے ہیں۔

یہ مطلب نہیں کہ آپ نبوت سے پہلے "ایمان" سے بالکل خالی تھے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ گو ہر نبی نبوت سے قبل نفس ایمان سے

متصف ہوتا ہے مگر ایمان وکتاب کی تفصیلات سے بے خبر ہونا فطرتی امر ہے کیونکہ جن حالات میں ایک نبی کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے ان حالات میں نہ ایمان کا پتہ ملتا ہے اور نہ نیکیوں کا وجود رہتا ہے۔ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔

اب آپ سمجھے کہ پیدائش کے وقت کوئی نبی "نبی" نہیں ہوتا اعطائے نبوت کا وقت وہ ہوتا ہے جب نبی کی جسمانی اور ذہنی قوتیں طبعاً اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔

سورہ یوسف میں دیکھئے۔ حق تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا	اور جب یوسفؑ کے تمام قویٰ حد کمال کو پہنچ گئے تو ہم نے اسے علم وحکمت سے نوازا۔

سورہ قصص ۲ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق بھی یہی فرمایا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰی اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا۔	اور جب موسیٰؑ اپنی بھری جوانی کو پہنچے اور قوت جسمانیہ وعقلیہ میں درست ہو گئے تو ہم نے انہیں علم وحکمت عطا فرمائی

حافظ ابن کثیرؒ نے دونوں جگہ "علم وحکمت" کی تفسیر "نبوۃ" سے کی ہے، حد کمال کی مدت کیا ہے؟ سورہ احقاف ۲ میں اس

کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً	یہاں تک کہ جب وہ بچہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا۔

کیا حضرت عیسٰیؑ بچپن ہی میں نبی بنا دیئے گئے تھے؟

آپ کہیں گے کہ اگر یہی بات ہے تو پھر حضرت عیسٰیؑ نے ماں کی گود ہی میں اس بات کا اعلان کیوں کر دیا تھا کہ "میں خدا کا رسول ہوں"

جب پوچھنے والوں سے حضرت مریمؑ نے اشارۃً کہا تھا کہ اس بچے کی حقیقت بجائے میرے خود اس بچے ہی سے پوچھ لو، دیکھئے سورۂ مریمؑ میں ہے۔

قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیاً، قال انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیاً (مریم ۳۰)	وہ لوگ بولے ہم گود کے بچے سے کیوں کر بات کریں۔ وہ بچہ بولا میں خدا کا بندہ ہوں۔ مجھے اس نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔

پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام بچپن میں نبی بن سکتے ہیں تو سردار دوجہاں بدرجۂ اولٰی بن سکتے ہیں۔؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حق تعالٰی نے بطورِ اعجاز

حضرت عیسیٰؑ کو گویائی عنایت فرما کر یہ جملے کہلوائے، اور مستقبل میں ہونے والی بات کو ماضی کے صیغہ سے ادا کرایا، یعنی مجھے آیندہ نبوت کا ملنا اس قدر یقینی ہے کہ یوں سمجھو مل گئی، یہ انداز کلام قرآن کریم میں شائع اور ذائع ہے۔ چنانچہ حضرت عکرمہ رضؓ تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ——— "قضی انہ یؤتینی الکتاب فیما قضی" (ابن کثیرؒ)

آسان محبت

بہر حال یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں دو رائیں ہو سکیں، لیکن اس تن آسانی اور فریب نفس کا کیا علاج کریں کہ یہ میٹھی محبت کرنے والے عمل اور قربانی کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے، اور خدا بھلا کرے ان میلادی مولویوں کا جو موضوع اور غلط روایتیں سنا کر ان تن آسانوں کی اور ہمت افزائی کرتے رہتے ہیں۔

تن آسانی کا یہ تباہ کن جذبہ ہی ہے جو کبھی عشق و محبت اور طریقت و حقیقت کی آڑ لیتا ہے اور کبھی بزرگوں کی تقلید کو بہانہ بناتا ہے، ——— خدا تعالےٰ رحمت نازل کرے ان محققین پر جنہوں نے احادیث کے بارے میں انتہائی تنقید سے کام لے کر موضوع اور مستند دونوں قسم کی روایتوں کو الگ کر دیا ——— خدا جانے

اگر یہ تحقیق نہ ہوئی ہوتی تو یہ "تن آسان" اُمّت میں کیا حشر برپا کر دیتے۔ اِس تحقیق کے باوجود تو حال یہ ہے کہ اگر کوئی ضعیف روایت بھی کسی مشہور کتاب سے ان کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو یہ اس کو اچھالتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک مولوی صاحب نے شب برات کی تائید میں ایک عربی کی عبارت حدیث کے نام سے بیان کی۔ لوگوں نے مجھ سے آکر نقل کیا۔ میں نے ان مولوی صاحب سے وہ حدیث مع حوالہ کے لکھوا کر منگوائی۔ انہوں نے حسب ذیل روایت لکھ کر بھیجی۔

یا اصحابی لا تنسوا اصواتکم	میرے صحابیو! تم اپنے مردوں کو قبروں
فی قبورھم خاصۃ فی شھر	میں فراموش نہ کیا کرو خاص کر رمضان میں
رمضان فان ارواحھم یاتون	کیونکہ ان کی روحیں تمہارے گھروں پر آتی
بیوتھم ینادی کل احد منھم	ہیں اور ہر روح ہزار مرتبہ پکارتی ہے
الف مرۃ من الرجال والنساء	کہ لوگو! ہم پر مہربانی کرو۔ چاہے ایک
اعطفوا علینا بدرھم او برغیف	درہم سے یا ایک روٹی سے یا روٹی
او بکسرۃ او بدعوۃ او بقراءۃ	کے ایک ٹکڑے سے یا دعا سے یا
ایۃ او بکسوۃ کسا کم اللہ من	تلاوت قرآن سے یا کپڑوں سے خدا تعالیٰ
لباس الجنۃ۔	تمہیں جنّت کا لباس پہنائے گا۔

میں منتظر تھا کہ اس روایت کے لئے حدیث کی مشہور صحیح کتابوں

میں سے کسی کتاب کا حوالہ میرے سامنے آئے گا مگر کیا دیکھتا ہوں
کہ تفسیر روح البیان کا حوالہ ہے۔ جسے روح البیان والے نے
ربیع الابرار کے حوالہ سے نقل کیا ہے ـــــــــ نہ راوی کا نام
ہے۔ نہ سند ہے۔ نہ روایت کا سر ہے نہ پیر ـــــــــ توبہ توبہ۔
اس قسم کی خرافات کو تو حضور کی طرف منسوب کرتے ہوئے رونگٹا
کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس عبارت میں تو
رمضان کا ذکر ہے اور اسے پیش کیا جارہا تھا شب برات کے جواز میں،
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شب برات والوں کو دھوکا ہو گیا کہ بجائے رمضان
کے شعبان ہی میں روحوں کا آنا سمجھ بیٹھے، یا پھر یوں کہئے کہ ایسے
"سابق بالخیرات" ہیں کہ قصداً رمضان سے پہلے ہی روحوں کو بلا لیتے ہیں تاکہ
شب برات کے حلوے سے انکا منہ بھر سکیں۔ بس اسی پر بدعات کی ساری عمارت کو قیاس کر لیجئے۔

میں نے ان مولوی صاحب سے بہتیرا عرض کیا کہ جناب
روح البیان اور پھر اس حدیث کا ماخذ ربیع الابرار ہرگز اس قابل
نہیں ہے کہ ہم اس پر اس درجہ اعتماد کر سکیں۔ یہ حدیث بالکل
موضوع ہے۔ مگر وہ یہی کہتے رہے کہ واہ صاحب! ہم بھلا اتنی
مشہور کتاب کی بات نہ مانیں ـــــــــ اور جناب یہ تو حدیث رسول
کا معاملہ ہے، لوگ تو قرآن شریف تک میں تحریف کرنے سے نہیں چوکتے۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی توبہ کرنا ضروری ہے ؟

ابھی حال کا واقعہ ہے کہ ایک مولوی صاحب نے میلاد شریف کے وعظ میں فرمایا —— "جب تک گناہگار خدا تعالیٰ سے توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے توبہ نہ کرے اس وقت تک اس کے گناہ معاف نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنی اس مشرکانہ تحقیق پر سورۂ نساء رکوع ۵ کی اس آیت سے استدلال کیا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔	اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تیرے پاس آتے پھر خدا تعالیٰ سے مغفرت چاہتے اور رسول ان کے لئے دعاء مغفرت کرتا تو وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا اور رحیم پاتے

تبایئے۔ کیسی انوکھی تحقیق ہے۔ معتقدین نے کیسی واہ واہ کی ہوگی —— لیکن کیا کوئی معمولی پڑھا لکھا انسان بھی اس خیال سے متفق ہو سکتا ہے جس جاہل کو یہ نہ معلوم ہو کہ "خدا سے معافی چاہنا" اور "رسول کا اسے بخشوانا" دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔

اور جو یستغفر لھم الرسول کا ترجمہ یہ کرتا ہو ـــــــــ رسول سے معافی مانگے ـــــــ اسے قرآن و حدیث کے نام لینے کا کیا حق ہے یہ تو اسلام کا سخت دشمن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا محرف ہے ـــــــ اس بدبخت کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بدعتی قیامت میں آب کوثر سے محروم رہے گا، پھر بھلا ایسی محبت سے کیا فائدہ کہ جو بجائے نفع دینے کے الٹا نقصان پہنچائے۔

بدعتی آب کوثر سے محروم رہے گا

آپ نے وہ مشہور حدیث سنی ہو گی کہ حضور جس وقت امت کے پیاسوں کو آب کوثر سے سیراب فرما رہے ہوں گے۔ ایک گروہ پیاس سے بے تاب حضور سے فریاد کرتا ہوا آپ کے قریب آنا چاہے گا۔ اچانک آپ کے اور اس گروہ کے درمیان حجاب قائم کر دیا جائیگا حضورؐ فرمائیں گے۔ یہ لوگ تو میری امت کے معلوم ہوتے ہیں انہیں کیوں روک دیا گیا۔ ملائکہ عرض کرینگے حضور! بیشک یہ لوگ آپ کی امت کے ہیں لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعتیں جاری کیں ـــــــ لا تدری ما احدثوا بعدك ـــــــ سرکار فرماتے ہیں اس پر میں وہی کہوں گا جو میرے بھائی عیسیٰؑ کہیں گے۔

وکنت علیھم شھیداً ما دمت ـ اے رب! جب تک میں ان میں رہا میں ان

فیھم فلما توفیتنی کنت — سے خبردار تھا۔ پھر جب تو نے مجھے اُٹھا لیا
انت الرقیب علیھم — تو صرف تو ہی ان کا خبر رکھنے والا تھا۔

اس حدیث میں ایک بات یہ سوچنے کی ہے کہ تمام گناہ گاروں میں صرف بدعتی ہی ایسا مجرم کیوں قرار دیا گیا ہے جسے آب کوثر سے محرومی نصیب ہوئی؟ ——— بات صاف ہے اور وہ یہ کہ ———

عالمِ آخرت میں اعمال کی شکل وصورت

آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر عمل بُرا ہو یا بھلا گو اس عالمِ مادی میں اپنی کوئی مادی شکل وصورت نہیں رکھتا اور ہم اُسے کسی مادی وجود میں نہیں دیکھ سکتے مگر دوسرے عالم میں یہ تمام اعراض واعمال اپنے اپنے مناسب قالبوں میں نمودار ہوکر ہمارے سامنے موجود ہوں گے۔ ہماری آنکھیں دیکھیں گی کہ یہ وہ عمل ہے جو دنیا میں ہم سے سرزد ہوا تھا۔ عمل صالح ایک فرحت افزا صورت میں اور عمل بد ایک روح فرسا صورت میں ہمارے جسم اور ہماری روح کو متاثر کرتا ہوا ہمارے لئے جنّت یا دوزخ کا سماں پیدا کردے گا،

جیسے حضور نے فرمایا ——— نماز اور روزہ خدا کے عذاب سے بچانے کے لئے ڈھال بن کر داھنی اور بائیں جانب سے نمودار ہونگے۔ اور بخیل سانپ بن کر بخیل کے گلے میں لپٹ جائے گا ———

پس دنیا میں جسے ہم "سنتِ رسول" کہتے ہیں۔ وہی سنتِ رسولؐ قیامت کے دار الجزا میں حوضِ کوثر کی شکل اختیار کرے گی۔——
اب بتایئے۔ جو شخص دنیا کے دار العمل میں ساقیٔ کوثر کے ہاتھ سے سنت مطہرہ کا جام پینے سے گریز کرے گا۔ وہ قیامت کے دار الجزا میں حوضِ کوثر کا حصہ دار کیسے ہو سکتا ہے۔

یاد رکھیئے۔ جس طرح دنیا میں سنت اور بدعت دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔——
"جب میری امت میں ایک بدعت جاری ہو جاتی ہے تو خدا تعالےٰ اس امت سے میری سنت کو اٹھا لیتا ہے۔——" اسی طرح قیامت میں بدعتی حوضِ کوثر کے قریب بھی نہیں ٹھٹک سکتا۔

کیا رسول انسان نہیں ہوتے۔؟

اس موقعہ پر ایک بات اور بھی سن لیجئے۔ یہ بدعتی لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے ان واقعات کو جنہیں آپ کی "انسانیت" صاف طور پر جھلکتی ہے بیان کرنے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ انہوں نے رنگ آمیز معجزات اور غلط واقعات کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ حضورؐ انسان نہیں بلکہ "کچھ اور" تھے، حالانکہ یہ مسکین "کچھ اور" کی تشریح

نہ اب تک کر سکے اور نہ آئندہ کر سکتے ہیں۔

یہ رکاوٹ ہے جو ان غریبوں کو قدم قدم پر پریشان کرتی ہے حالانکہ اس مسئلہ کو اسلام نے بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔

اسلام سے پہلے نبی کی حیثیت کے متعلق دنیا افراط و تفریط میں مبتلا تھی، ایک طرف یہودی تھے جن کے ہاں نبی صرف ایک پیشگو کی حیثیت رکھتا تھا، اس صفت کے علاوہ ان کے نزدیک نبی سے ہر ممکن بدعملی سرزد ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ نبی کو ایک معمولی انسان سمجھتے تھے دوسری طرف عیسائی اور یونانی تھے، جو یہ سمجھتے تھے کہ منصب نبوت پر کوئی انسان سرفراز نہیں ہو سکتا، اس لئے نبی انسانیت سے پاک خود مجسم خدا یا خدا کا جزء ہونا چاہیے۔

اسلام نے آکر دنیا کو افراط و تفریط کی اس گمراہی سے نکال کر اعتدال کی صحیح راہ پر ڈالا اور بتایا کہ نبی یقیناً ایک انسان ہوتا ہے مگر ایسا انسان جو اپنے تمام جسمانی اور روحانی خصائص میں جملہ انسانوں سے بلند تر ہوتا ہے، وہ یہودی ٹھوکر کھا گئے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کے محض انسانی رُخ پر نظر ڈال کر انہیں ایک معمولی انسان قرار دے دیا، اور وہ عیسائی بھی بے راہ ہو گئے جنہوں نے حضرت

مسیح علیہ السلام کے صرف مافوق بشریت خصائص پر نگاہ ڈال کر انہیں خدا یا خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔

دیکھئے، کفار قریش نے حضور کی بشریت پر اعتراض کیا اور کہا

اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا — کیا خدا نے ایک انسان کو رسول بنا کر
(بنی اسرائیل ۱۱) — بھیجا ہے؟

معجزات دیکھ کر کہا:۔

ھَلْ ھٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اَفَتَاْتُوْنَ — یہ تو تمہاری ہی طرح ایک بشر ہے۔ کیا
السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء ۱) — تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو

بشریت کا اعلان

منکرین کا استبعاد دور کرنے کا آسان طریقہ تو یہ تھا کہ حضورؐ فرماتے "لوگو! تم مجھے نبی ماننے میں کیوں تامل کرتے ہو، واقعی میں انسان نہیں ہوں" ——

لیکن بجائے اس کے جناب نے صاف صاف اعلان فرمایا ——

ایک بار نہیں بار بار فرمایا ——

انما انا بشر مثلکم — بے شک میں تو تم جیسا ایک انسان
یوحی الی انما الھکم — ہوں فرق یہ ہے کہ مجھ پر اس بات کی وحی
الہ واحد (کہف ۱۲) — آتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے۔

یہ مسئلہ ہر نبی کے دور میں معرکۃ الآرا رہا ہے۔ مگر کسی نبی نے بھی

بشریت کا انکار نہیں کیا، بلکہ علی الاعلان اپنی بشریت کا اعتراف کیا ہاں۔ ساتھ ساتھ ان خصوصیات کی طرف ضرور اشارہ فرمایا۔ جن کی وجہ سے وہ تمام انسانوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ سورہ ابراہیم رکوع ۲ میں دیکھیے۔ انبیاء علیہم السلام کے اعلان کے الفاظ یہ ہیں :-

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔

اس کے رسولوں نے جواب دیا بلاشبہ ہم تمہاری طرح بشر ہیں لیکن خدا تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے

نبی کی انسانیت تمام انسانوں سے بالاتر اور ممتاز ہوتی ہے

"احسانِ خداوندی" یعنی وحی کا جو امتیاز خدا تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بخشا ہے وہ معمولی امتیاز نہیں بہت بڑا امتیاز ہے، یہ وہ امتیاز ہے جو نبی کو انسانی کمالات کی آخری معراج پر پہنچا دیتا ہے اور نبی صرف روحانی برتری ہی میں نہیں بلکہ جسمانی اوصاف میں بھی نوع انسانی سے بلند تر ہو جاتا ہے۔

ہم ان لوگوں سے قطعاً اتفاق نہیں کر سکتے جو کہتے ہیں——

"نبی عام انسانوں سے صرف اس وقت ممتاز ہوتا ہے جس وقت اس پر وحی آ رہی ہو۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد نبی انسانوں جیسا

ہوتا ہے" ——— یہ مثلیت کا انتہائی غلو ہے، جس سے دینِ الٰہی کو ایک اصولی نقصان پہنچا ہے۔

مثلیت کے غلو سے کیا نقصان پہنچا ———؟

وہ نقصان یہ ہے کہ ایک طبقہ نے اقوال اور احادیث رسول کو تشریعی حیثیت دینے سے انکار کر دیا ہے، وہ شریعت صرف کتاب الٰہی کو قرار دیتے ہیں، اور احادیث اِن کے نزدیک عارضی انتظامی معاملات کے سوا اور کچھ نہیں جو اسی دور کے لئے مخصوص تھے یہ حضرات نہ انہیں قابلِ اتباع کہتے ہیں نہ اسلام میں داخل۔

اس گروہ کے ایک مشہور عالم کی ایک عبارت میں آپ کو سناتا ہوں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اس عقیدہ کی ضرب کہاں پڑتی ہے۔

مولینا اسلم جے راج پوری

مولینا اسلم صاحب جیراج پوری سے آپ واقف ہوں گے، انہوں نے "تعلیماتِ قرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، مولانا صاحب اس میں رسالت کے احکام کی تشریح کرتے ہوئے ص۹۵ پر لکھتے ہیں ——— "اصولی قانون صرف اللہ کی کتاب ہے ——— جملہ ضوابط اس کی روشنی میں باہمی مشورہ سے

بنائے جائیں گے ــــــ صفحہ ۱۲۸ پر فرماتے ہیں ــــــ
رسولوں کا فریضہ صرف پیغامِ الٰہی پہنچانا ہے اور بس" ــــــ
مولف نے اپنے دعوے کے لئے آیاتِ قرآنی سے ضرور استدلال کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ آیات کے سیاق و سباق کو نظر انداز کرنے میں مؤلف نے بڑی بے باکی سے کام لیا ہے، ــــــ مولف کا مقصد یہ ہے کہ اسوۂ رسول ہمارے لئے قابلِ اتباع نہیں ہے، ہمیں تو براہِ راست قرآن کریم سامنے رکھ کر قوانین وضع کرنے چاہئیں کیونکہ حضور تو معاذ اللہ صرف ایک ڈاک کے ہرکارے تھے جن کی عملی زندگی کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی، خدا جانے مؤلف کے نزدیک ان آیات کا کیا مطلب ہے جنہیں ہم رات دن پڑھتے ہیں۔

(۱) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	آپ فرما دیجئے، اگر تم لوگ خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ خدا تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔
(۲) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔	لوگو! البتہ رسول کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔
(۳) مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا	تمہیں رسول جو دے اسے لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

(۴) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى — وہ رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا
إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى — وہ تو جو کچھ کہتا خدا کی وحی ہوتی ہے۔

بھلا آپ سوچئے، جس نبی کا منصب ——— یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم ——— ہو وہ امت کا مربی ہو اور معلم ہو، مزکی ہو اور مقنن ہو اس کے ارشادات کو شریعت سے کیسے خارج کیا جا سکتا ہے، اور اگر خارج کر بھی دیں تو پھر رہ کیا جاتا ہے قرآن کریم تو ایک اصولی قانون اور اساس دین ہے، جس کی شرح بہر حال ضروری ہے۔ اسی لئے ہم مجبور ہیں کہ احادیث رسول کے محفوظ ذخیروں کی طرف رجوع کریں۔

احکام رسول میں من مانی تقسیم

مؤلف تعلیمات قرآن نے اس اعتراض کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، ——— کہ اگر نبی کا پورا اسوہ واجب التعمیل نہیں ہے تو پھر نماز کی رکعات، روزہ، حج اور دیگر اعمال اسلامی کی مکمل تشریح کہاں سے معلوم کریں۔ یا پھر یہ ہو کہ جو شخص جتنی رکعتیں پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ اور اس پر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔

چنانچہ مولانا جیراج پوری کو ایک جگہ اقرار کرنا پڑا کہ ———

"ہمارے رسول نے جملہ احکام قرآنی مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔

2019NS

وغیرہ پر عمل کر کے دکھایا ہے، اور یہ عمل ہمارے پاس عملِ متواتر کی صورت میں موجود ہے، ـــــــ اس کی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے " ـــــــ سبحان اللہ۔ کس عمدگی سے عملِ رسول کو عین اسلام مانا ہے۔ اس کے بعد رہ کیا جاتا ہے ـــــ ؟ صرف آپ کے سیاسی۔ تمدنی اور معاشرتی احکام۔ انہیں آپ ہنگامی قرار دیتے ہیں۔ جو ایک امیر قوم کی حیثیت سے آپ نے نافذ کئے۔ نہ رسول الٰہی کی حیثیت، ـــــ لیکن رسول اللہ کی حیثیت کو، تقسیم کرنا اور آپ کے ان احکام کو جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے باقی زندگی سے علٰحدہ کرنا بغیر کسی دلیلِ قطعی نے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، مولانا کا فرض تھا کہ وہ اس تقسیم کے لئے کوئی ناقابلِ رد ثبوت پیش کرتے۔

ہمیں تو قرآن کریم میں خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہ مل سکا جس کی بناء پر یہ حکم نکلتا ہو کہ حضور کے مذہبی اعمال تو دائماً قابلِ تقلید ہیں مگر آپ کے سیاسی اور تمدنی فیصلے آپ کے عہد کے ساتھ مخصوص تھے، ان حضرات کو خدا تعالیٰ کا یہ حکم نہ بھلانا چاہئے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ
اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا	حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا

اَنۡ یَّکُوۡنَ لَهُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا ۔ (احزاب ۵)

رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کردے تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا ۔

فرمائیے " اَمۡرًا " نکرہ ہے ۔ اس کے عموم سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے ۔

حضرت امام ولی اللہ دہلوی کا فیصلہ

مجھے اس موقعہ پر آپ کو یہ بتانے ہیں " اہل نہ کرنا چاہئیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بعض باتیں ایسی ضرور ہیں جو ہر دور میں ہر مسلمان کے لئے واجب التعمیل نہیں ہیں اہل قرآن نے اس معاملہ میں بڑی افراط سے کام لیا ہے "، انہیں انصاف پسندی اور ایمانداری کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فیصلہ پر غور کرنا چاہئیے ۔ جو فیصلہ حضرت الامام نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— " حضور کی چند قسم کی باتیں واجب التعمیل نہیں ہیں ، مثلاً وہ باتیں جو آپ عادۃً کرتے تھے ، یا اتفاقیہ اور بر سبیل تذکرہ بیان فرماتے تھے ، یا وہ

کام جو آپ نے جزئی مصلحت کے ماتحت کئے ـــــــــــ یقیناً ایسے امور امت کے لئے حتمی اور لازمی نہ تھے۔ چنانچہ حضور فرماتے ہیں۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشئی من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشئی من رائی فانما انا بشر	میں ایک انسان ہوں جب تم سے کوئی بات دینی بیان کروں تو اس کو اختیار کرو اور اگر اپنی رائے سے کہوں تو میں ایک انسان ہوں۔

ــــــــ "اذا امرتکم بشئی من رائی" میں وہی امور داخل ہیں جو حضرت شاہ صاحب نے بیان فرمائے ہیں:

صحابۂ کرام کی نگاہ میں حضورؐ کے فیصلوں کی اہمیت

حضرت عمرؓ کا واقعہ

اس سلسلہ میں میں آپ کو حضرت عمرؓ کا واقعہ سنانا چاہتا ہوں تاکہ قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ صحابہ کرام حضورؐ کے فیصلوں کو کس قدر اہمیت دیتے تھے، ــــــــ حضرت عمرؓ صحابۂ کرام میں بڑے مدبر اور سنجیدہ صحابی تھے، مشہور مفسر ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں دو شخصوں کا واقعہ بیان کیا ہے کہ یہ دو شخص حضورؐ کے پاس اپنا مقدمہ لے کر حاضر ہوئے۔ آپ نے مدعی اور مدعا علیہ کا بیان سنکر فیصلہ دیدیا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا اس نے کہا،

میں چاہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ سے اس پر نظر ثانی کراؤں، یہ دونوں عمرؓ کے پاس پہنچے اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ کیا تم حضورؐ کے فیصلہ کے بعد میرے پاس آئے ہو اس لئے کہ تمہیں حضورؐ کے فیصلہ پر اطمینان نہیں؟ — اچھا ذرا ٹھیرو، عمرؓ اندر گئے اور ننگی تلوار نکال کر لائے اور اس شخص کا سر قلم کر دیا جو اپنی بے اطمینانی اور بے اعتمادی کا اظہار کر رہا تھا — دوسرے نے جب یہ نقشہ دیکھا تو وہ بھاگا اور حضورؐ سے آکر سارا واقعہ بیان کیا — آپ نے فرمایا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ عمرؓ نے ایک مسلمان کو قتل کیا ہوگا۔ فوراً قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔	اے نبی! قسم ہے تیرے رب کی وہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کے فیصلوں پر اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ انہیں خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیں۔

اس آیت نے نازل ہو کر حضرت عمرؓ کو اس خون سے بری کرا دیا اور حضورؐ کو اطمینان ہو گیا — ابن کثیرؒ نے اس واقعہ کو "غریب" کہا ہے کہ اس کی سند میں، ابن لہیعہ، آتا ہے۔ مگر پھر خود ہی کہا ہے کہ یہ اثر اس سند کے علاوہ ایک دوسری سند سے بھی

مروی ہے۔ جس میں اتنا اور ہے کہ یہ دونوں شخص پہلے ابوبکرؓ کے پاس گئے۔ ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر انہیں چلتا کر دیا کہ وہی ٹھیک ہے۔ جو حضورؐ نے فرما دیا ہے۔ اس کے بعد ان کی شامت اعمال انہیں حضرت عمرؓ تک لے گئی۔ اور یہ سارا قصہ پیش آیا۔

حضورؐ کی بے مثال انسانیت

بہرحال ہمیں نہ تو بدعتیوں کی افراط سے کوئی تعلق ہے نہ اہل قرآن کی تفریط سے، ہم تو اسی کو حق سمجھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان تھے ——— ایسے انسان جو تمام انسانیت سے بلند تر تھے، وہ جس وقت سے منصب رسالت پر سرفراز ہوئے تھے اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری لمحہ تک ہر وقت خدا کے رسول تھے۔ ان میں حیثیت شخصی اور حیثیت رسالت گو اعتبار میں دو حیثیتیں تھیں مگر وجود میں دونوں ایک تھیں جن کے درمیان عملاً فرق کرنا ناممکن تھا۔

ہم نے یہ حدیث پڑھی ہے کہ ——— "جب حضورؐ نماز کی صفوں کو درست فرمایا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے ——— "میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسا ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے ہے"۔ بھلا ہم میں کون ایسا ہے۔ جو اس بات کا دعویٰ کرے"

ـــــــــ ہم نے امام بخاری کی کتاب الصوم والی یہ مشہور حدیث بھی پڑھی ہے کہ جب صحابہ کرام نے حضورؐ کو صوم وصال رکھے دیکھ کر آپ کی پیروی کرنی چاہی تو آپ نے ان کو منع کیا اور فرمایا۔

ایکم مثلی ابیت یطعمنی ربی ولیسقینی	تم میں کون میری مثل ہے، میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے

کہئے۔ کوئی ہے جو یہ بات کہہ سکے؟ ـــــــــ اور پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم میں کوئی اس شان کا انسان نہیں ہے کہ اس کی آنکھ سو جائے مگر اس کا دل بیدار رہے حالانکہ

وکذالک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم (بخاری کتاب الاسرار)	یہی حال تمام پیغمبروں کا ہے کہ ان کی آنکھیں سو جاتی ہیں۔ اور ان کے دل نہیں سوتے۔

مشہور ہندوستانی سائنسدان سر سی۔ وی۔ رامن کی تقریر

میں پھر ایک مرتبہ مکرر عرض کر دوں کہ جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ کا کمال اس میں سمجھتے ہیں کہ آپ کو "انسانیت" کی حد سے نکال کر دائرہ ربوبیت میں داخل کر دیں اور صاف صاف یہ کہہ دیں کہ عین ربی بہ حقیقت و مجازاً عربی" ـــــــــ وہ حضورؐ کے

ساتھ وہی برتاؤ کر رہے ہیں۔ جو گمراہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ کیا، اس صورت میں وہ حضور کی سچی بلندی پہ پردہ ڈال رہے ہیں، اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت میں تباہی اور خسران ہے، انہیں یاد رکھنا چاہئیے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ کمال "الوہیت" نہیں کہ یہ تو شرک ہے جسے آپ دنیا سے مٹانے آئے تھے۔ بلکہ آپکا اصلی شرف عبدیت ہے جس کو قائم کرنے کے لئے آپ نے تیئیس سال تک جد و جہد کی۔ اور آج بہت سی دنیا باوجود اسلام سے تعصب برتنے کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی بلند و بالا شخصیت کو ماننے پر مجبور ہے ——

صرف اس لئے کہ آپ نے انسان پرستی، نفس پرستی، اور خدا کے سوا ہر چیز کی پرستاری کو کھلا چیلنج کیا۔ —— ابھی حال ہی میلاد النبی کی تقریب کے موقعہ پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے —— ہندوستان کے مشہور سائنس داں، سر۔ سی۔ وی۔ رامن نے کہا

"پیغمبر اسلام اپنے آئیڈیل کے اعتبار سے موجودہ زمانہ کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ہی سب سے پہلے انسان ہیں جنہوں نے بت پرستی کو چیلنج کیا، کیونکہ میری رائے میں بت پرستی ہی وہ

خرابی ہے۔ جو انسان کی عقلی ترقی کو نشوونما سے روکتی ہے"

ان چند جملوں پر بار بار غور کیجئے اور دیکھئے کہ "عقلیت" کے موجود دور میں سائنٹفک انسان اسلام سے کتنا قریب ہے، مگر وہ اسے تہذیبی حیثیت سے قبول کیوں نہیں کر لیتا ——؟۔

—— معاف کیجئے اس کی راہ میں میرا کردار رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اسی جلسہ میں ہندوستان کی مشہور سیاسی لیڈر مسز نائیڈو نے مسلمانوں سے یہ کہا ——

—— "محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اصول پیش کئے ہیں۔ یعنی توحید، اخوت اور مساوات، یہ زندگی کے بہترین اصول ہیں مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ پہلے ان پر خود عمل کریں پھر دنیا کو ان کی طرف دعوت دیں"

بات سچ ہے کہ قبر پرستی، تعزیہ پرستی، پیر پرستی کے ساتھ ساتھ دنیا کو توحید کی طرف کیسے بلایا جا سکتا ہے، اور جو قوم خود ہی شریف، رذیل، مغل، سید، پٹھان اور دوسری لاتعداد تقسیموں میں بٹی ہوئی ہو وہ مساوات اور اخوت کی کیا علم بردار بن سکتی ہے۔

تمہید کی گذارشات کے بعد

میں نے آپ کا اتنا وقت اس لئے ضائع کیا ہے تاکہ

آپ کو یہ بتا دوں کہ میں نے معمولِ عام کے خلاف ربیع الاول میں وفات النبی کا موضوع کیوں اختیار کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس ابتدائی گفتگو سے اس حقیقت کو سمجھ گئے ہونگے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی آپ کے ذہن نشین ہوگئی ہوگی کہ یہ میلا دیئے اس قسم کے واقعات بیان کرنے سے کیوں جی چراتے ہیں ـــــــ

ان چند تمہیدی باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی بہتر سمجھتا ہوں کہ حضور کی وفات کے حالات بیان کرنے سے پہلے "موت اور موت کا قرآنی فلسفہ" اور اس کے متعلق بعض ضروری چیزیں بھی بیان کرتا چلوں کہ اس سے آپ کو اگلے مسائل سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

موت کیا ہے؟

ان دہریوں کو چھوڑ دیجئے جو انسانی زندگی کو اسی دنیا کی زندگی پر ختم سمجھتے ہیں اور اس لئے ان کے نزدیک موت مٹ جانے اور فنا ہو جانے کا نام ہے جو حالات کی طبعی رفتار کے ماتحت بغیر کسی مارنے اور جلانے والے کے آپ ہی آپ وقوع میں آجاتی ہے۔

وَقَالُوا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ۔

یہ ملحد کہتے ہیں کہ ہماری دنیا کی زندگی بس یہ ہے کہ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ اور ہمیں سوائے "دہر" کے اور کوئی ہلاک نہیں کرتا۔

ہم ان نادانوں کے نقطہ نظر سے کیا بحث کریں جو اس عظیم الشان کارخانہ ہستی کو ایک اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہیں، ان چند نفوس کے علاوہ ہر مذہب اور ہر جماعت اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ موت فناء محض کا نام نہیں ہے، بلکہ دار العمل سے دار الجزاء میں منتقل ہونے کا نام موت ہے. میں اس سے بھی تعرض نہیں کروں گا کہ دار الجزاء کی نوعیت اور اس کی تفصیل میں اسلام اور دوسرے مذاہب میں کیا اختلاف ہے، لیکن بہرکیف موت کے متعلق ہر مذہب کا یہی تصور ہے جو میں نے عرض کیا، اقبال نے کہا ہے

ہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

زندگی کے تین گھر

اس اجمال کی تشریح کے لئے آپ کو اس موقعہ پر اسلامی نقطہ نگاہ سے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ دار العمل اور دار الجزاء کیا ہے؟ اسلام نے زندگی کے تین گھر بیان کئے ہیں، دار العمل، یعنی موجودہ فانی زندگی، یہ حقیقت میں تو عمل کی جگہ ہے، لیکن اعمال کی جزاء و سزا بھی تھوڑی بہت اس عالم میں ظاہر ہو جاتی ہے. عالم برزخ، یہ وہ عالم ہے جو دنیا اور آخرت کے بیچ میں حائل ہے اور اس میں بھی روح انسانی اپنے اعمال کی جزا و سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے دار آخرت، یہ وہ حقیقی دار الجزاء ہے جو موجودہ دنیا کے ہر نقش و نگار

کے مٹ جانے کے بعد ایک نئے آسمان و زمین کے ساتھ جدید قوانین کے ماتحت قائم ہوگا، اسی عالم میں انسان کو اپنے اعمال کی پوری پوری جزاء و سزا ملے گی، ——— عالم برزخ اور عالم آخرت حقیقت میں دارالجزاء ہی کی دو منزلیں ہیں۔ اور دنیا کے مقابلہ میں ان دونوں پر دارالجزاء کا اطلاق ہوتا ہے۔ پس اب یوں کہئے کہ زندگی کے دو گھر ہیں۔ عمل کی جگہ اور بدلہ کی جگہ اور ——— موت نام ہے پہلے گھر سے دوسرے گھر میں چلے جانے کا

موت کے لئے قرآن کی اصطلاح

اسی وجہ سے قرآن کریم نے موت کے لئے "خدا کی طرف لوٹ جانے" کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ سورۂ جمعہ رکوع ۱ میں فرمایا:

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ	آپ فرما دیجئے، جس موت سے تم بھاگتے ہو
مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ	اس سے تم ضرور ملنے والے ہو، پھر تم عالم
اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ	الغیب والشہادۃ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور
فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ	وہ تمہیں تمہارے اعمال سے باخبر کر دیگا،

سورہ بقرہ میں کہا ——— اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ———
ہم لوگ اسی کی ملکیت ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

سورۂ قیامت میں موت کا پورا نقشہ کھینچ کر فرماتے ہیں۔

كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ

ہرگز نہیں۔ جب روح ہنسلی تک آپہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کرکے بچانے والا، اور وہ مرنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ جدائی کا وقت قریب آگیا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی اس روز تیرے رب کی طرف کھنچ کر چلا جاتا ہے۔

موت کیوں ضروری ہے؟

موت کی اس تشریح کے بعد اب میرے لئے یہ سمجھانا آسان ہوگیا ہے کہ موت کا آنا کیوں ضروری ہے، —— آپ جانتے ہیں کہ انسان جیسی عظیم الشان مخلوق بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کی گئی —— یقیناً انسان ایک خاص مقصدِ زندگی رکھتا ہے۔

لیکن یہ بات کہ زید نے کہاں تک زندگی کے مقصد کو پورا کیا اور عمر نے اس میں کتنی کوتاہی کی —— ؟ اس دنیا میں نمایاں نہیں ہوسکتی۔ اس کا دار و مدار اعمالِ زندگی کے نتائج پر ہے جس کے لئے جزاء کا گھر مخصوص ہے، کیونکہ وہی عالم ایسا ہے۔ جس میں خیر و شر کے فطری امتیاز کا ظہور تام ہوگا۔ اور اس عالم کے بپا ہونے کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کی زندگی بے نتیجہ اور اس کے کام بے اثر ثابت نہ ہوں۔

پس اس غرض کے لئے موت کا آنا اور اس گھر سے اُس گھر کی طرف منتقل ہونا ضروری ہوا۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔	اے لوگو! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

یہ آیت سورہ مومنون رکوع ۶ میں ہے، اس میں یہی بات کہی جا رہی ہے کہ اگر موت کے بعد اُس عالم میں جانا ضروری نہ ہو تو انسانی زندگی بے مقصد ہو کر رہ جائے،

اسی بات کو مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سورہ ملک میں دیکھئے۔ فرمایا

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا	وہ ذات بڑی بابرکت ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور وہ ذات ہر شئی پر کامل اقتدار رکھتی ہے جس نے موت و زندگی کا سلسلہ اس لئے قائم کیا تاکہ وہ جانچے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر پہلی زندگی (یعنی دار العمل) نہ ہوتی تو عمل کیسے ظہور میں آتے اور دوسری زندگی (یعنی دار الآخرت) نہ ہوتی تو ان اعمال کا بدلا

بھلا نتیجہ کیوں کر ظاہر ہوتا، اسی طرح اگر موت کا سلسلہ نہ ہوتا تو پہلی زندگی کا اختتام اور دوسری زندگی کا آغاز کیسے ہوتا، کیونکہ موت ہی آخرت کی زندگی کا دروازہ ہے۔

سورۂ آل عمران ۱۹ میں فرمایا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ	ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور اے
وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ	انسانو! تم کو قیامت میں تمہارے اعمال
يَوْمَ الْقِيَامَةِ	کے پورے پورے بدلے دیئے جائیں گے۔

یعنی موت اس لئے لازمی ہے تاکہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی شروع ہو اور اس زندگی میں نیکوں کو نیکیوں کے اور بروں کو ان کی برائیوں کے بدلے دیئے جائیں،

سورۂ زمر ۳ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا

انك ميت وانهم ميتون	یقیناً آپ بھی وفات پانے والے ہیں
ثم انكم يوم القيامة	اور آپ کے مخالفین بھی، پھر تم سب
عند ربكم تختصمون۔	اپنے رب کے پاس جھگڑو گے۔

حضورؐ کی وفات برحق ہے

موت کے اس فلسفہ کو قرآن کریم نے جس خوبی سے بیان کیا ہے بس وہ قرآن کریم ہی کا حصہ ہے، اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انفرادی

موت ہو یا اجتماعی (قیامت) یقیناً وہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کیونکہ اگر دنیا میں نیکی کا وجود و قیام رحمت ہے تو پھر موت کے رحمت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ جس کے اندیشہ اور امید پر یہ نیکیاں ہو رہی ہیں اور برائیوں سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔

یہ ساری بحث موت کے عام فلسفہ کے ماتحت تھی۔ گو اس کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے مگر اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صریح حدیث بھی موجود ہے۔ وہ بھی سنیئے ـــــــ مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت منقول ہے ـــــــ جس میں حضورؐ فرماتے ہیں

"جب خدا تعالیٰ کسی امت پر رحم فرمانے کا ارادہ کرتا ہے تو امت سے پہلے اس پیغمبر کو وفات دیدیتا ہے۔ اور پھر اس پیغمبر کو امت کے لئے مغفرت کا پیش خیمہ بنا دیتا ہے۔ اور جب کسی امت کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ تو اس امت پر اس کے رسول کی موجودگی میں عذاب نازل کرتا ہے ـــــــ اور اس طرح اس پیغمبر کی آنکھ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ کیونکہ ان کافروں نے اس کی نافرمانی کی اور اس کی تکذیب کی"۔

حدیث کے دونوں جزوں کو پیش نظر رکھ کر چند ضروری باتیں سنئیے جو اس کی تفصیل و تشریح کے لئے ضروری ہیں۔

دنیا کی تباہ شدہ قومیں

حضرت نوحؑ کی قوم

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کو ایک اور ہی انداز سے سمجھانا چاہا ہے۔

آپ کا مطلب صاف ہے یعنی جو پیغمبر اپنی قوم کے سامنے ان کی زندگی میں وفات نہیں پاتا۔ بلکہ اس کے برعکس پیغمبر زندہ رہتا ہے اور قوم اس عالم سے کوچ کر جاتی ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس امت پر خداتعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔ جس میں وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ خدا کا رسول نجات پاتا ہے اور اپنے دشمنوں کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے دیکھ کر خدا کے وعدۂ نصرت کا عین الیقین حاصل کرتا ہے ——

دیکھئے! سب سے پہلے اس دنیا میں قوم نوحؑ پر خدا کا عذاب آیا۔ صورت یہی ہوئی کہ حضرت نوحؑ زندہ رہے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے اپنی نافرمان قوم کی تباہی دیکھی۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ۔

نوحؑ کی قوم نے نوحؑ کی تکذیب، ہم نے نوحؑ اور اس کے ایماندار ساتھیوں کو نجات دی اور تکذیب کرنے والوں کو غرقِ آب کر دیا، کیونکہ وہ لوگ اندھے بنے ہوئے تھے۔

یہ وہ عالمگیر سیلاب تھا جس نے زمین پر ایک متنفس کو بھی باقی نہ چھوڑا۔ اور دنیا کے لئے سامانِ عبرت بنا۔

حضرت ہودؑ کی قوم (قوم عاد)

قوم نوحؑ کے بعد قوم عاد آسمانی عذاب سے تباہ ہوئی۔ چونکہ اس بدنصیب قوم کی ہلاکت اس کی ناپاک زندگی کی بدولت مقدر ہو چکی تھی اس لئے حضرت ہودؑ کی زندگی میں اس پر عذاب آیا۔

وَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا	اور جب قوم عاد پر ہمارا حکم عذاب پہنچا تو ہم
وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ	نے ہود اور ان کے ایماندار ساتھیوں کو
مِّنَّا وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ	نجات بخشی اپنی مہربانی سے اور ان لوگوں
عَذَابٍ غَلِيْظٍ (هود)	کو ایک بڑے ہی ذلیل عذاب سے بچایا۔

ایسا بڑا عذاب کہ ——— وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ——

ان مجرموں کی نسل منقطع کر ڈالی گئی اور کوئی ان کا نام لیوا باقی نہ رہا۔

وہ قوم جو عرب کے سب سے بہترین حصہ حضرموت اور یمن میں خلیج فارس کے ساحلوں سے حدود عراق تک پھیلی ہوئی تھی ———

فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا

——— سات راتوں اور آٹھ دن تک مسلسل چلنے والی تیز و تند ہواؤں سے نیست و نابود کر دی گئی، اور آج ریت کے ٹیلوں کے سوا

اس مقام پر کچھ نظر نہیں آتا — فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ
كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ فَهَلْ تَرَىٰ لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ — (حاقہ)

حضرت صالحؑ کی قوم (قوم ثمود)

تیسری قوم "قوم ثمود" ہے یہ ان لوگوں کی اولاد ہے جو حضرت ہودؑ کے ساتھ بچ گئے تھے۔ حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب ان کا مقام سکونت ہے، شام سے حجاز کی طرف آنے والا ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات و آثار اس وقت موجود پاتا ہے۔

یہ قوم ایک اضطراب انگیز (رجفۃ) چیخ سے (صیحہ) جو نہایت زور آور تھی (عاتیہ) ہلاک کر دی گئی

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ (حجر)

پس جب ہمارا حکم عذاب پہنچا تو ہم نے صالح اور ان کے ایماندار ساتھیوں کو نجات دی اور اس روز کی رسوائی سے بچا لیا۔

قرآن ان کی بستیوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔

فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا

پھر دیکھ کیا ہوا ان کے فریب کا انجام، کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے ان کو اور انکی سب قوم کو سو ان کے یہ گھر ہیں جو ڈھیے ہوئے پڑے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۞ وَأَنجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (نمل)

ہیں ان کے ظلم کی وجہ سے اس میں جاننے والوں کے لئے نشانِ عبرت ہے، اور ہم نے اس عذاب سے اہل ایمان و تقوی کو نجات دی۔

حضرت لوط کی قوم

وہ چوتھی قوم جو اپنے رسول کی موجودگی میں تباہ ہوئی "قوم لوط" ہے۔ یہ قوم اپنی اخلاقی کمزوریوں میں یہاں تک تجاوز کر چکی تھی کہ اسے اپنی آبادی میں کسی "پاکباز" انسان کا رہنا بھی گوارا نہ تھا، چنانچہ یہ لوگ اپنے پیغمبر کے متعلق کہا کرتے تھے:۔ —— أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ —— انہیں نکالو اپنی بستی سے یہ بڑے نیک اور پاکباز بنتے ہیں —— بھلا ہمارے ہاں پاکبازوں کا کیا کام؟

.. .. خدا کے غضب نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کر دیا۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ۞ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ (حجر)

سورج نکلتے نکلتے ایک ہولناک آواز نے ان کی بستیوں کو زیر و زبر کر دیا اور پکی ہوئی مٹی یعنی کھنکروں کی ان پر بارش کی۔

خدا تعالیٰ نے اس عذاب سے اپنے رسول کو نجات بخشی —— —— قوم برباد ہوئی اور رسول زندہ رہے ——

فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ إِلَّا پھر ہم نے حضرت لوط اور ان کے گھر والوں یعنی

عَجُوزًا فِي الْغَابِرِيْنَ (شعراء) — مومنوں کو نجات دی مگر ایک بڑھیا یعنی حضرت لوط کی بیوی رہ گئی ان رہ جانے والوں میں۔

سدوم و عامورہ کی یہ بستیاں اردن کے اس جانب آباد تھیں جہاں آج بحر لوط واقع ہے یہ ابتداء سے سمندر نہ تھا بلکہ یہ جگہ ان بدنصیبوں کی سکونت گاہ تھی ——— لیکن عذاب الٰہی کے خوفناک زلزلوں نے اس زمین کا تختہ الٹ دیا اور یہ زمین چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا۔ اسی کا نام بحر میت اور بحر لوط پڑ گیا ——— جس کی موجیں آج بھی ہمیں عبرت و عظمت کی دعوت دے رہی ہیں ———

حضرت شعیب کی قوم (مدین والے)

پانچویں نمبر پر قوم شعیب ہے جو شرک و کفر کی خرابیوں کے علاوہ معاملات میں انتہائی طور پر بدمعاملہ اور خائن واقع ہوئی تھی

انہیں برائیوں سے بالآخر اس قوم کو " زلزلہ عظیم " اور آگ کی بارش کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جَاثِمِيْنَ (الحجر) — پھر انہیں زلزلے نے آپکڑا اور وہ صبح کو رہ گئے اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے۔

نہ صرف اوندھے پڑے ہوئے بلکہ آگ میں جھلسے ہوئے بھی کیونکہ ابھی زلزلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ آسمان سے آگ برسنے لگی۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ
يَوْمِ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ (شعراء)

پھر انہوں نے شعیب کو جھٹلایا پس آ پکڑا
ان کو بادل والے عذاب نے (جس میں آگ
تھی) بیشک وہ بڑے ہولناک دن کا عذاب تھا

یہ قوم بحر قلزم کے مشرقی کنارے عرب کے شمال مغرب میں شام سے متصل حجاز کے آخری حصہ میں آباد تھی جو حصہ اپنے محل وقوع کے، اعتبار سے ایک عظیم الشان تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اور ایسا شاداب و پر فضا تھا کہ قرآن اسے "ایکہ" یعنی "بن" کہہ کر پکار رہا ہے کہ وہاں پھولوں۔ پھلوں۔ میووں کے اس قدر باغات تھے کہ باہر سے نظارہ، کرنے والا اسے گھنے درختوں کا بن محسوس کرتا تھا

ظاہر ہے کہ یہ قوم اپنے وقت کی ایک اعلیٰ ترین خوشحال اور متمدن قوم ہوگی۔ جس نے کم تولنے، کم ناپنے، اور قسم قسم کی بددیانتیاں کر کے اپنے آپ کو تباہ کر لیا —— اور حضرت شعیب نے اپنی زندگی میں ظلم و کفر کی ہلاکت اور ایمان و عدل کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

وَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا
وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا
وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ

اور جب ہمارا امر عذاب پہنچا تو ہم نے شعیب
کو اور ان لوگوں کو جو ایمان دار تھے اپنی
مہربانی خاص سے نجات دی اور ظالم قوم کو

فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ کَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ۔ (ھود)

"چیخ" کے عذاب میں پکڑلیا، پس وہ لوگ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے گویا کہ وہ ان گھروں میں آبادہی نہ تھے۔ خبردار! مدین والے تباہ ہوئے جس طرح ثمود والے تباہ ہوئے تھے

فرعون مصر

فرعون اور اس کی قوم بھی خدا کے عذاب میں مبتلا ہوئی۔ اس نے خدا کی زمین پر اپنی خدائی کا سکہ جما رکھا تھا اور مذہبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے اپنے آپ کو خدا منواتا تھا۔ اور جس طرح عام طور پر ظالم حکومتوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ ملک کے باشندوں میں نسلی اور طبقاتی تفریق پیدا کرکے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرتی ہیں۔ یہی حکمت عملی فرعون نے اختیار کررکھی تھی۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ اِنَّهٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ

بے شک فرعون زمین پر بہت بڑھ چڑھ گیا ہے۔ اور اس کے باشندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کررکھا ہے اور ایک گروہ کو کمزور بنا رکھا ہے وہ ان کے بیٹوں کو قتل کرتا ہے اور عورتوں کو زندہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ بڑا مفسد ہے

مصر ایک متمدن ملک تھا، فرعون اس کی تمدنی ترقیاں پیش کرکے عوام سے کہا کرتا تھا کہ یہ سب کچھ میری خدائی کا نتیجہ ہے۔ اور

یہ تمام ترقیاں میرے ہی دم سے قائم ہیں

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهٖ	فرعون نے اپنی قوم سے کہا، اے میری
قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ	قوم کیا مصر کی حکومت پر میرا اقتدار
مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ	قائم نہیں ہے۔؟ اور دیکھو یہ تمام
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۔ اَفَلَا	نہریں میرے ہی ماتحت جاری ہیں۔کیا
تُبْصِرُوْنَ ۔	تمہیں یہ بات بھی نہیں سوجھتی یعنی "بس
(زخرف ۵)	مجھے ہی رب اعلیٰ مانو۔"

مصر کی اس ظالم حکومت کی طرف حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے دو مطالبے پیش کئے۔ سرکشی چھوڑ کر بندگی اختیار کرلے، یعنی مسلمان ہوجا، اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ	اور ہم ان سے پہلے قوم فرعون کو آزما چکے ہیں اور
وَجَاءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۔ اَنْ	ان کے پاس عزت والا رسول پہنچا اس نے کہا
اَدُّوْا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ	خدا کے بندوں کو اپنے باطل اقتدار سے آزاد کرکے
رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ وَاَنْ لَّا تَعْلُوْا	میرے حوالہ کردو، میں خدا کا امانتدار رسول ہوں
عَلَى اللّٰهِ (دخان)	اور یہ کہ خدا کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کرنا چھوڑ دو

فرعون اپنے ظالمانہ اقتدار سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوا اور نہ اپنی مذہبی خدائی چھوڑ کر خدائے برحق کی بندگی میں آنا گوارا کیا

اس پر خدا کا عذاب آیا اور مع اپنے لاؤ لشکر کے بحر قلزم میں غرق کر دیا گیا۔

فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ۚ وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ۚ وَ اَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ۚ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ (شعراء)	پھر ہم نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنا عصا دریا پر مار۔ دریا پھٹ گیا۔ اس کا ہر حصہ اتنا بڑا تھا جتنا بڑا ایک پہاڑ، اور دوسرے دل کو اس دریا کے پاس پہنچا دیا۔ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو نجات بخشی اور دوسروں کو اس میں غرق کر دیا۔

آئین قدرت یہ ہے کہ جو ترقی یافتہ قوم جس سامانِ تمدن پر ناز و غرور اختیار کرتی اور اس گھمنڈ سرپسندگی کے حدود سے تجاوز کرتی ہے اسے اسی سامان میں پھانس کر تباہ کیا جاتا ہے۔ ——————

فرعون کہا کرتا تھا، میرے اقتدار سے ٹکر لینے والا موسیٰ ناکام ہو کر رہے گا۔ کیونکہ موسیٰ اپنا ذاتی اقتدار چاہتا ہے۔ جب میرے سوا کوئی "اللہ" ہی نہیں ہے تو "رسول اللہ" کے کیا معنی ——————

مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ —— یہ رائے میری بڑی گہری تحقیقات کا نتیجہ ہے —— قدرت نے موسیٰ کو ان کی آنکھوں سے باطل کی تباہی کا منظر دکھا دیا —— فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ —— بقرہ —— یہی خدا کا وعدہ تھا۔

بنی اسرائیل کا ایک ٹوڈی (قارون)

تباہ ہونے والی قوموں اور برباد ہونے والے افراد میں قارون کا نام بھی نمایاں طور پر آتا ہے، قارون گو بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا۔ مگر اس نے اپنی قوم سے غداری کرکے فرعونی حکومت سے ساز باز کرلی تھی۔ ——— اور اسی لئے یہ بنی اسرائیل جیسی غریب اور نادار قوم میں صرف تنہا بہت بڑا سرمایہ دار شخص تھا۔ نہ اسے اپنی قوم کی بےکسی اور غربت کا خیال آتا تھا، نہ اپنی قوم کے معصوم بچوں کے بے دردانہ قتل پر اس کی آنکھیں کھلتی تھیں، اسے کام تھا اپنے عیش و آرام سے، اور اپنی سرمایہ داری سے، جو اسے قومی غداری اور حق دشمنی کی بدولت حاصل ہوئی تھی۔

اس کا کام یہ تھا کہ یہ حضرت موسیٰ کی دعوتِ حق اور تحریکِ آزادی کے خلاف بنی اسرائیل کو فرعونی حکومت کی غلامی پر قانع رکھے، اور ان میں آزادی کا احساس زندہ نہ ہونے دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت سمجھایا لیکن جب یہ نہ مانا اور ادھر فرعونی حکومت کی تباہی کا وقت بھی قریب آگیا تو قدرت نے اسے مع اس کی حرام دولت کے زمین میں دھنسا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا قانون یہ ہے کہ باطل کی تباہی کے ساتھ ساتھ۔ آگے پیچھے۔ وہ لوگ

بھی تباہ کر دیئے جاتے ہیں جو اس کے سہارے جیتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو کسی طرح نہیں سمجھتے کہ آزادی کے سوکھے ٹکڑے غلامی کی قورما روٹی سے بہتر ہوتے ہیں،

قدرت نے آزادی کی راہ کے اس روڑے کو راستہ سے ہٹایا،

——— کس طرح ہٹایا ——— ؟ ——— قرآن کہتا ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ وَاَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۔

یہ آیات سورۃ قصص کی ہیں، ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایک روز قارون نے اپنی دولت و ثروت کے مظاہرہ کرنے کی غرض سے اپنی قوم کے سامنے اپنا ایک عالیشان جلوس نکلوایا۔ تاکہ اس پروپیگنڈہ سے حکومت فرعون اور اس کے ہوا خواہوں کی دھاک بیٹھ جائے اور دنیا یہ جان لے کہ بنی اسرائیل کے اصلی نمائندے یہ لوگ ہیں، موسیٰ اور ہارون نہیں

ہیں۔ اور یہ بھی ہو کہ بنی اسرائیل کے عوام موسیٰؑ سے ٹوٹ کر قارون کے ساتھ مل جائیں ——— یہی ہوا ——— اور دنیا پرست لوگ اس شاندار جلوس کو دیکھ کر کہنے لگے، ——— اے کاش ہم کو بھی اتنا ہی سرمایہ اور شان و شوکت نصیب ہوتی جتنی قارون کو ملی ہوئی ہے ——— واقعی قارون بڑا نصیبے والا ہے۔ ———

جناب نے ملاحظہ کیا کہ مال و دولت کی نمائش میں پروپگنڈے کی کس قدر طاقت ہے، اور اس سے ذہنیتوں کو کس طرح بدلا جا سکتا ہے ——— بنی اسرائیل کے جاہلوں پر دولت کے یہ غلط اثرات دیکھ کر اہل علم طبقہ آگے بڑھا اور اپنی قوم کی خیرخواہی کا فرض ادا کرتے ہوئے کہنے لگا۔ تم پر افسوس ہے، تم اتنی بات نہیں سمجھتے کہ اصلی نعمت تو اللہ کا وہ بدلہ ہے جو نیکوں کو ان کے نیک اعمال کے صلہ میں ملتا ہے ——— نہ وہ حرام دولت جو غداری کر کے حاصل کی جائے ——— اور یہ انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو صبر کرتے ہیں ———

تم تو دولت کی نمائش دیکھ کر بے قابو ہو گئے نہ اس حکومت کے مظالم یاد رہے نہ اس کی بے ایمانیاں۔ ——— پس جب قدرت نے دیکھا کہ اب قارون نے دعوتِ حق کی مخالفت کے لئے کمر کس لی ہے اور قارون موسیٰ علیہ السلام کے دعوائے ظلم و استبداد کے خلاف دنیا پر ظاہر

کرنا چاہتا ہے کہ جس قوم میں قارون جیسے خوش حال لوگ ہوں اس قوم کو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قوم فرعونی حکومت کے مظالم سے تباہ حال اور غریب ہو چکی ہے، اور ہو رہی ہے۔ تو خدا تعالےٰ نے قارون کو اس کی دولت سمیت زمین میں دھنسا دیا، اس وقت نہ اس کی دولت کام آئی نہ اس کے لونڈی غلام اور حمایتی، ——— صبح اٹھ کر جب ان تمنا کرنے والوں نے اسے دیکھا تو انہیں ہوش آیا اور اس وقت انہوں نے اعتراف کیا کہ مال دولت خدا تعالیٰ کی مقبولیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو بلا امتیاز ایمان و کفر تقسیم کی جاتی ہے، جس کو خدا تعالیٰ چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے، ———

ایحسبون انما نمدھم بہ من مال وبنین نسارع لھم فی الخیرات بل لا یشعرون ۔کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ مال دولت مقبولیت کی دلیل ہو نہیں بلکہ انہیں علم نہیں

ان تمام تباہ شدہ قوموں اور افراد کی سیرت و کردار پر ایک نگاہ ڈالو اور پھر جواب دو، کیا یہ قومیں اسی قابل نہیں تھیں کہ تباہ کر دی جائیں ؟ اور کیا جو کچھ ہوا تھا وہ عین رحمت نہ تھا۔ جس پر خدا کی حمد و ثنا بجا لانی چاہیئے ——— ؟ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ ——— ظالم دُم بریدہ ہو کر رہ گیا ——— حق یہ ہے کہ تمام تعریفیں صرف خدا ہی کو سزاوار ہیں •

کیا امت محمدیہ عذاب کے قانون سے مستثنیٰ ہے؟

حدیث کے دوسرے پہلو کی تشریح | میں نے ابوہریرہ رضؓ والی حدیث کے دوسرے جز کی تصدیق کے لئے آپ کے سامنے قرآن کریم کا تاریخی بیان پیش کر دیا ہے

قرآن اس کی تصدیق کر رہا ہے کہ جب کسی قوم کو حق تعالیٰ نے ہلاک کرنا چاہا تو اس قوم کے پیغمبر کو اس کے سامنے وفات نہیں دی بلکہ پیغمبر زندہ رہا۔ اور اس کے سامنے قوم تباہ ہو گئی ——

پس یقیناً ہمیں شکر کرنا چاہیے کہ ہم خدا کے عذاب سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔

لیکن تم کہو گے کہ جب عذاب الٰہی ظلم و معصیت کا لازمی نتیجہ ہے وما ظلمھم اللہ ولکن انفسھم یظلمون —— جس میں تاخیر و مہلت تو دی جا سکتی ہے۔ مگر بالکل چھوٹ نہیں مل سکتی ——

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ وَّلٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی —— "اگر خدا تعالیٰ ظلم و گناہ پر فوری مواخذہ شروع کر دے تو زمین پر ایک متنفس نہ بچے، لیکن وہ انہیں ایک معین وقت تک اصلاح کا موقعہ عنایت کرتا ہے۔"

——— اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ——— "تم لوگ اگلی امتوں کے قدم بقدم چلوگے" ——— یعنی یہ امت ہمیشہ متقی نہیں رہے گی، تو پھر یہ امت عذاب کے قانون سے کیسے مستثنیٰ ہوسکتی ہے؟

دیکھو خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۔ اے پیغمبر آپ میری سنت میں تبدیلی نہیں پائیں گے

اس سوال کا جواب سننے سے پہلے عذاب کے بارے میں خدا تعالیٰ کا ایک قانون سن لیجئے، سورہ انعام میں فرمایا ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ	آپ فرما دیجئے، خدا تعالیٰ اس بات پر
عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ	قادر ہے کہ اے انسانوں تم پر اوپر سے
مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ	عذاب نازل کرے یا نیچے سے عذاب بھیجے
شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ	یا مختلف فرقے کرکے تمہیں آپس میں بھڑا
بَاْسَ بَعْضٍ ۔ ———	دے اور ایک کو ایک کی لڑائی کا مزہ چکھا دے

اختلاف امت عذاب ہے

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ماتحت حضرت جابر رضؓ کی ایک حدیث نقل کی ہے ——— جابر رضؓ کہتے ہیں۔

——— جب "عذابًا من فوقکم" کا جملہ اترا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ

نے فرمایا ــــــ اعوذ باللہ منک ــــــ جب "او من تحت ارجلکم"
ــــــ اترا تب بھی آپ نے کہا ــــــ اعوذ باللہ منک ــــــ
ــــــ لیکن جب ــــــ او یلبسکم شیعا ــــــ نازل ہوا تو
فرمایا ــــــ ھذا الیسر ــــــ یعنی یہ آسان ہے۔ ــــــ
جابر کہتے ہیں ــــــ" اگر حضورؐ اس سے بھی پناہ مانگتے تو آپ کی امت
کو اس سے بھی پناہ مل جاتی ــــــ وان استعاذہ لاعاذہ۔
لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس لئے کہ یہ قدرت کے عام قاعدہ
کے خلاف تھا کہ ظلم و معصیت پر کسی نوعیت کا بھی عذاب نہ آئے۔
لیکن پھر کیا یہ واقعہ ہے کہ آج تک امت محمدیہؐ پر نہ تو" اوپر کا
عذاب " یعنی بارش کا طوفان اور ہواؤں کا عذاب آیا" اور نہ
"نیچے کا عذاب " یعنی زلزلہ اور سیلاب کی تباہ کاریاں نازل
ہوئیں؟ ــــــ نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں اس قسم کی
بربادیوں کے بے شمار واقعات ملتے ہیں ــــــ اس لئے صحیح
بات وہ نہیں ہے جو خوش فہمی کے طور پر عوام میں مشہور ہے۔ سچی بات
وہی ہو سکتی ہے۔ جسے صاحب شریعت خود بیان فرمائیں ــــــ
چنانچہ شداد ابن اوس کی حسب ذیل روایت پر غور کیجئے۔ یہ روایت
اصل معاملہ کو واضح کر دے گی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"مجھے میرے رب نے زمین سمیٹ کر دکھائی۔ یہاں تک کہ میں نے مشرق و مغرب تک دیکھ لیا۔ میری امت کا اقتدار اسی مقام تک پہنچے گا جہاں تک میری نگاہ پہنچی۔ اور مجھے دو خزانے عطا ہوئے۔ ایک سفید۔ دوسرا سرخ۔ یعنی دونوں قسم کے انسان میری امت میں داخل ہوں گے۔ اور میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میری امت "قحط عام" سے بالکل برباد نہ ہو، اور ان پر اس طرح دشمن مسلط نہ ہو کہ ان کا بالکلیہ استیصال کر دے، اور ان میں گروہ بندی اور خونریزی نہ ہو۔ میرے رب نے جواب دیا۔ اے محمدؐ! میرا فیصلہ رد نہیں ہوتا۔ پہلی دونوں دعائیں تو قبول کی جاتی ہیں مگر یہ ضرور ہوگا کہ تیری امت میں اختلاف و خونریزی کا عذاب نازل ہو، حضورؐ نے فرمایا ——— اس لئے مجھے اپنی امت کے بارے میں ایک بات کا سخت خوف ہے۔ اور وہ ہے گمراہ لیڈروں اور رہنماؤں کا وجود، جب میری امت میں تلوار چل پڑے گی تو پھر قیامت تک میان میں نہیں جائے گی۔ (مسند احمد)

خلاصہ یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات امت سے پہلے واقعی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ امت عذاب سے بچ گئی۔ لیکن "عذاب سے بچ جانے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے بڑی

اور خارجی تباہ کاریوں سے پہلی گناہ گار امتوں کا بالکلیہ استیصال کیا ہے۔ کوئی بالکل غرق کردی گئی، کوئی ہواؤں کے طوفان سے تباہ ہوئی۔ کسی کو زمین کے زلزلہ نے بالکل تہس نہس کردیا۔ اس طرح باوجود سخت سے سخت نافرمانیوں کے بھی امت محمدؐ تمام روئے زمین سے نہیں مٹ سکتی۔ ہاں جزئی طور پر اگر کہیں کہیں اس قسم کی تباہیاں نازل ہوں تو اس کی نفی نہیں ——

لیکن وہ تیسری نوعیت کا عذاب یعنی۔ اختلاف اور باہمی جنگ و جدال۔ تو وہ عالمگیر اثرات کے ساتھ بھی روئے زمین کی تمام امت کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے —— جبکہ امت اپنی بداعمالیوں کے باعث اس عذاب کی مستحق ہوجائے ——

آہ! آج بدنصیب امت عذاب کے اسی خوفناک دور سے گزری ہے جو عالم اسلامی کی اخلاقی اور دینی پستی کا نتیجہ ہے۔

حدیث ابوہریرہ کے پہلے حصہ کی تشریح سے متعلق یہ ضروری بحث تھی جو آپ کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے پیش کی گئی اب آپ کو یقین کرنا چاہئے کہ " اختلاف امتی رحمۃ " کا نعرہ لگانے والے آپ کو فریب میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ آپ سیاست اور مذہب کے اس اختلاف سے نکلنے کا ارادہ بھی نہ کریں جس نے

ہماری اجتماعی شیرازہ بندی کو فنا کر دیا ہے ، اور ترقی کے تمام امکانات ہم سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں ——————

اس صداقت مآب رسول پر ہزاروں سلام ۔ جس نے گمراہ اور بے دین رہنماؤں سے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا ۔ مگر صد ہزار افسوس اس غافل مسلمان پر جو ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے باوجود بھی آنکھیں نہیں کھولتا ۔ (وفات النبی کی دوسری تشریح)

انس بن مالک کی حدیث

حدیث ابو ہریرہ رضؓ وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین تشریح ہے ۔ لیکن اس کی مزید وضاحت انس ابن مالک کی وہ حدیث کرتی ہے ۔ جس میں حضورؐ نے صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ۔

اے میرے صحابہ ! میری زندگی تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ میں تم سے باتیں کرتا ہوں ۔ تم مجھ سے باتیں کرتے ہو ، جب میں وفات پا جاؤں گا تو میری وفات تمہارے لئے بہتر ثابت ہو گی ۔ کیونکہ وفات کے بعد تمہارے عمل میرے سامنے لائے جائیں گے ، اگر نیک اعمال ہوں گے تو خدا تعالیٰ کی تعریف و تشکر کروں گا اور اگر برے اعمال ہوں گے تو تمہارے لئے دعا و استغفار کروں گا ۔ (رواہ الحارث فی مسندہ)

امت کے لئے دعاءِ مغفرت

اس آقا پر ہزاروں سلام
جو اپنی امت پر، ان کی

جانوں سے زیادہ مہربان تھا ——— النبی اولی بالمومنین من انفسہم ——— بتایئے جس ذات گرامی نے عالمِ قدس کی بے حجاب جلوہ نمائیوں میں بھی اپنی امت کو فراموش نہ کیا ہو اور برابر اپنی مقبول دعاؤں میں گناہ گار انِ امت کو یاد رکھتا ہو، وہ دنیا کی زندگی میں امت کو کیسے بھول سکتا تھا، جبکہ امت کی حالت ہر وقت اس کے سامنے رہتی تھی۔

اور پھر تھوڑی بہت مغفرت اور بخشش پر اکتفا نہیں کیا۔ جب رحمتِ عام کا وعدہ لے لیا، تب مطمئن ہوئے۔ ذرا وعدہ الٰہی کے ان الفاظ پر غور کرو جو امت کے گناہوں کی بخشش کے لئے حضرت حق نے ارشاد فرمائے۔ ———

حضرت ابوذر غفاری رضہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ایک رات حضورؐ کے ساتھ نوافل پڑھے۔ ابن مسعود بھی میرے ساتھ تھے۔ حضورؐ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے کرتے جب اس آیت پر پہنچے

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۔ اے رب! انہیں اگر عذاب دے تو یہ تیرے
وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ ۔ بندے ہیں اور اگر تو ان کے گناہ معاف

أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم   کردے تو تو بڑے غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

تو آپ تمام رات اسی آیت کو دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

صبح کو میں نے ابن مسعودؓ سے کہا، رات کے واقعہ کے بارے میں حضورؐ سے پوچھو کہ جناب نے تمام رات اسی آیت میں کیوں گزار دی ابن مسعودؓ اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ میں نے خود ہمت کی اور حضورؐ سے عرض کیا ——— حضور! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، رات کو تو ایک ہی آیت میں صبح کر دی، ہم میں سے کوئی اگر ایسا کرتا تو جناب ناراض ہوتے ——— ارشاد فرمایا بھئی جب میں اس آیت پر پہنچا تو قیامت میں خدا کے قہر و جلال کا وہ پورا نقشہ میرے سامنے آگیا، جبکہ حضرت عیسیٰؑ اپنی امت کے مشرکانہ اعمال سے بیزاری ظاہر فرمائیں گے اور یہ آیت پڑھیں گے میں نے اس کیفیت سے متاثر ہو کر امت کے لئے دعاء مغفرت کرنی شروع کر دی۔ میں نے عرض کیا، حضورؐ خدا کی طرف سے آپ کو کیا جواب ملا، فرمایا۔ اگر لوگ اس جواب سے مطلع ہو جائیں گے تو عمل کرنا چھوڑ بیٹھیں گے، اور خدا تعالیٰ کی رحمت پر تکیہ کر لیں گے میں نے عرض کیا۔ اچھا۔ اگر جناب اجازت دیں تو میں صرف اتنی بات

لوگوں سے کہہ دوں۔ اس میں بھی ان کے لئے بڑی خوشخبری ہے حضور نے اس کی اجازت دیدی۔ میں یہ کہنے کے لئے چلا۔ اتفاق سے راستے میں حضرت عمرؓ مل گئے، میں نے واقعہ کی تمام کیفیت بیان کی۔ آپ نے سُنا اور مجھے اپنے ساتھ لے آئے ______ حضورؐ سے عرض کیا۔ سرکار! رات کے واقعہ کی صرف اتنی کیفیت سُن کر بھی لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں گے۔ بہتر سمجھتا ہوں کہ اس کا اعلان عام نہ کرایئے، حضورؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور ابوذر غفاریؓ کو اس سے منع کر دیا۔ (احمد)

دعاء مغفرت کے جواب میں خدا تعالےٰ کا وعدہ

جو بات اس حدیث میں مخفی رکھی گئی ہے۔ وہ خدا تعالےٰ کا جواب ہے۔ جو رات بھر کی دعاؤں کے بعد حضرت حق کی طرف سے ملا ______ لیکن وہ جواب امام احمد ہی کی ایک روایت میں جو انہوں نے حضرت عمروؓ بن عاص سے نقل کی ہے صراحت کے ساتھ ملتا ہے،

حضرت عمروؓ ابن عاص رضؓ کہتے ہیں ______ (جب حضور اس آیت پر پہنچے۔ اور حضور خداوندی میں رونے لگے تو آپ کے پاس جبریلؑ آئے، اور عرض کیا، اے اللہ کے نبی! مجھے خدا تعالیٰ

نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کا سلام قبول فرمائیے۔ گو خدا تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے مگر اس کا حکم ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ جناب اس قدر کیوں رو رہے ہیں، آپ نے وجہ بیان فرمائی۔ جبریلؑ گئے اور خدا کی طرف سے یہ پیغام لائے

إِنَّا سَنُرْضِيكَ فِي أُمَّتِكَ وَلَا نَسُوءُكَ	اے نبی ہم تمہیں تمہاری امت کے بارے میں خوش کر دیں گے رنجیدہ نہ ہونے دیں گے

ان دونوں روایتوں کو ابن کثیر نے امام احمد کے حوالہ سے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

ایک اشکال کا حل

مجھے اس اعتراض کا جواب دینا ہے کہ جب دنیا میں حضورؐ کو امت کی مغفرت کے بارے میں مطمئن کر دیا گیا تھا تو پھر اب آپ عالم قدس کی خلوتوں میں امت کے لئے استغفار میں کیوں مصروف ہیں۔

اس اشکال کا حل یہ ہے کہ حضرت حق نے مغفرت کے بارے میں حضورؐ کو راضی کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا تعالیٰ ہر اس شخص کی مغفرت کر دے گا جو اپنے منہ سے اپنے آپ کو حضورؐ کا امتی کہے گا ——— اور نہ ——— نہ عمل کی شرط ہے۔ نہ اخلاق کی دیکھ بھال ——— نہ یہ دیکھا

جائے گا کہ اس کے اعمال و اخلاق بھی "ایک امتی" جیسے ہیں یا نہیں۔ اور نہ اس کی پرواہ کی جائے گی، کہ حضورؐ خود اسے اپنے امتی ہونے کی سند دیتے ہیں یا نہیں۔

وہ ستر ہزار افراد جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں جائیں گے۔!

مستحقین مغفرت کون لوگ ہیں

یہ بات نہیں۔ بلکہ حسن عمل اور حسن اخلاق کی بہر حال شرط موجود ہے، آپ نے اس روایت کا عام طور پر چرچا سنا ہوگا جس میں حق تعالیٰ نے حضور سے یہ وعدہ کیا ہے کہ میں آپ کی امت کے ۷۰۰۰۰ ہزار افراد کو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل کروں گا۔

دیکھئے۔ میں آپ کو اس حدیث کی پوری حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں ——— حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی زبان سے یہ خوشخبری سنکر فرمایا ——— حضورؐ آپ نے اور زیادتی کی دعا کی ہوتی ——— فرمایا ——— ہاں ——— میں نے زیادتی کی دعا کی تھی ——— حق تعالیٰ نے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار افراد کے اضافہ کا اور وعدہ فرمایا ——— یعنی ان ستر ہزار میں ہر ہزار کی تعداد پر ستر ہزار اور بڑھا دیئے۔

حضرت عمرؓ نے دوبارہ کہا۔ حضور! آپ نے زیادتی کی اور دعاء کی ہوتی۔ فرمایا۔ ہاں۔ کی تھی۔ خدا تعالیٰ نے ہر فرد واحد کے ساتھ ستر ہزار افراد امت کی مغفرت کا وعدہ فرما کر زیادتی کی دعاء قبول فرمائی۔ —— حضرت عمرؓ نے پھر کہا —— حضورؐ! —— تو آپ نے اور دعاء کی ہوتی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ہاں میں نے کی تھی۔ اور تیسری مرتبہ حق تعالیٰ نے اس طرح عطا فرمایا۔ عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے جو اس روایت راوی ہیں۔ ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر اور ہاتھ کشادہ کرکے دکھائے، یعنی "حق تعالیٰ نے لپیں بھر بھر کے گناہ گاران امت کو جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمایا"۔ (مسند احمد)

—— انس ابن مالک کی روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے کہا "حضورؐ! اور زیادتی ہونی چاہیئے"۔ آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا —— اس پر عمرؓ نے کہا —— اے ابوبکر! اور کیا چاہتے ہو کافی تو ہے —— ابوبکرؓ بولے —— عمرؓ! —— تم پہ کیا بوجھ ہے۔ اگر ہم سب کے سب جنت میں چلے جائیں؟ —— حضرت عمرؓ نے فرمایا —— ابوبکر! —— واللہ اگر خدا چاہے گا تو ایک ہی

رب میں تمام مخلوق کو جنّت میں ڈال دے گا ــــــ حضورؐ نے عمر رضؓ کا جواب سنکر فرمایا ــــــ صدق عمر ــــــ عمر رضؓ نے سچ کہا۔

جب صحابہ کرام یہ تمام بحث سُن چکے تو حضورؐ کے بعد انہوں نے آپس میں یہ بحث شروع کی کہ یہ لوگ کون ہوں گے ــــــ بعض نے کہا ــــــ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اسلام ہی میں پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے شرک نہیں کیا ــــــ اسی طرح صحابہ کرام نے اپنی اپنی رائے پیش کی، ــــــ حضورؐ اکرم یہ تمام بحث سن رہے تھے۔ آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا ــــــ

جو سوال اس وقت تمہارے سامنے درپیش ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ــــــ "وہ ستر ہزار افراد وہ ہوں گے جو نہ تو جادو ٹونے پر عمل کرتے ہیں اور نہ دوسروں سے گنڈا تعویذ کراتے ہیں اور نہ وہ آگ سے دغواتے ہیں، اور نہ بدفالی کے قائل ہیں۔ اور صرف اپنے رب پر اعتماد کرتے ہیں، ــــــ (بخاری مسلم۔ احمد)

رحمت و مغفرت کی روایات میں یہ روایت سب سے زیادہ امید افزا ہے۔ اپنے پیش نظر رکھ کر دو باتوں پر غور فرمایئے۔

(۱) صحابہ کرام خدا کی رحمت کا وعدہ سُنکر فوراً اس بات کی

طرف متوجہ ہوئے کہ وہ لوگ کون ہوں گے، اور کس قسم کے اعمال و اخلاق والے اس وعدہ کے مستحق بنیں گے —— جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے نزدیک مغفرت کے لئے حسن عمل لازمی تھا، جس کے بغیر خدا کی مہربانی اور فضل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) —— حضورؐ نے ان ستر ہزار —— افراد امت کے جو اعمال بیان فرمائے ان سب کا مآل کار اور خلاصہ "توحید" ہے یعنی خدا تعالیٰ کو لاشریک کر کے پیدا کرنے والا۔ دینے والا۔ بنانے والا اور بگاڑنے والا یقین کرنا ہے۔ اس طرح پر کہ نہ تو اس یقین کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھے اور نہ اس کے خلاف دل میں کوئی عقیدہ پیدا ہو۔ اگر وہ ایسا موحد ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ قیامت میں اس کی عملی کمزوریوں سے درگزر فرمانے کا وعدہ کر رہا ہے، —— عمل کی لغزشیں قابلِ معافی ہو سکتی ہیں۔ شرک کی ایک چھینٹ بھی معاف نہیں کی جا سکتی۔ ——

اب سمجھئے اس اعتراض کا جواب —— حضورؐ کا عالم برزخ کی زندگی میں امت کے لئے دعاء مغفرت کرنا اسی لئے ہے کہ امت میں توحید کا وہ کردار باقی رہے جس کی بدولت وہ مغفرت الٰہی

کے مستحق ہو سکیں ——— ہاں - اگر خدا کا وعدہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہ ہوتا تو حضورؐ کو بے فکر ہو جانا چاہیے تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مغفرت کا ہر وعدہ اور رحمت کا ہر پیغام اسی شخص کے لئے ہے جو اپنے عقیدہ اور اپنے عمل میں توحید ربانی کا مکمل مظہر بن جائے کہ یہی بنیاد ہے تمام نیک اعمال اور اچھے اخلاق کی ' روضۂ اقدس میں حضورؐ کا فیض عام

ایک بزرگ کا واقعہ

آپ ہمارے مسلک سے واقف ہو گئے ہوں گے - ہم توحید پر قائم رہنے والے کو تو خدا کی رحمت اور نبی کی شفاعت کا مستحق سمجھتے ہیں - لیکن جس شخص کی توحید میں فرق ہو وہ چاہے حضورؐ کی زبانی محبت میں کتنا ہی آگے بڑھا ہوا ہو ہمارے نزدیک ——— بلکہ خدا اور اس کے رسول کے نزدیک ——— نہ رحمت کا مستحق ہے نہ نبی کی شفاعت کا '

لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم عمل اور عقیدہ کی توحید کی شرط لگائے بغیر خدا کی مغفرت اور نبی کی شفاعت کو تقسیم کرتے رہیں - گویا یہ ہمارے گھر کی چیز ہے ' ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہم تم سے زیادہ حضورؐ کی رحمۃ عام اور فیض عام کے قائل ہیں - لیکن اسی حد تک جس حد تک

شریعت نے ہمیں اجازت دی ہے ، اور ہم کیسے اس کا انکار کرسکتے ہیں جبکہ ہم رات دن کے واقعات میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ رحمت والے کا خدا کا دربار فیض و کرم آج بھی اسی طرح لگا ہوا ہے جس طرح زندگی میں لگا ہوا تھا۔

علامہ ایک مشہور بزرگ ہیں۔ کہتے ہیں۔ میں روضہ اقدس کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا۔ اور اس نے کہا ——— "السلام علیک یا رسول اللہ! میں نے سنا ہے کہ جو شخص آپ کے پاس اپنے لئے دعائے مغفرت کرانے آتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی بخشش سے محروم واپس نہیں جاتا۔ خدا کا وعدہ ہے ———

ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما ——— اگر وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا خدا سے استغفار کرتے اور نبی ان کے لئے دعا ء مغفرت کرتا تو یقیناً وہ لوگ خدا تعالیٰ کو معاف کرنے والا اور مہربان پاتے۔

یا رسول اللہ ——— میں گناہ گار ہوں۔ اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ میرے لئے خدا تعالیٰ سے دعائے مغفرت کیجئے۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے :-

یاخیر من دفنت بالقاع اعظمه — فطاب من طیبهن القاع والاکم
نفسی الفداء لقبر انت ساکنه — فیه العفاف وفیه الجود والکرم

——— یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا، میری آنکھ لگ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ حضورؐ خواب میں تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا ——— عتبیٰ ——— جلدی جا۔ اور اس اعرابی سے کہدے کہ خدا تعالیٰ نے تیرے گناہ معاف کر دیے۔

اس حکایت کو آپ کے مشہور مفسر ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

رحمۃ للعالمینی کا حقیقی منظر

میں نے یہ واقعہ محض آپ کو سنایا ہی نہیں۔ بلکہ میں اس قسم کے واقعات کو سچ بھی سمجھتا ہوں، میرا اور آپ کا اختلاف اگر ہو سکتا ہے تو اس بات میں کہ آپ حضور کی "رحمۃ للعالمینی" کو صرف دعاء و مغفرت میں محدود سمجھتے ہیں، آپ کو اب تک یہ سمجھایا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت اللعالمین ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ آپ گناہ گاروں کے شفیع ہوں گے اور اپنی دعاؤں سے امت کو خدا کی ناراضگی سے بچا لیں گے، میں یہ کہتا ہوں کہ یہ سزا یا غلط تخیل دراصل آپ کی غلامانہ ذہنیت کی

پیداوار ہے اور جس کی وجہ سے آپ نے رحمۃ للعالمینی کے اعلیٰ تخیل کو پس پشت ڈال دیا ہے دیکھئے ۔ قرآن کریم نے آپ کو کس معنی میں رحمۃ للعالمین کہا ہے ۔ اور آپ کی رحمۃ للعالمینی کا اصل مفہوم کسے قرار دیا ہے ۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (انبیاء)	اور ہم نے لوح محفوظ میں لکھنے کے بعد تمام آسمانی کتابوں میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ ہماری زمین کے جائز مالک وہی لوگ ہونگے جو ہمارے "صالح بندے" ہیں یقیناً اس قسم کی خوشخبری ہے خدا کی بندگی کرنیوالے اپنے مطلب کو پہنچتے ہیں اور اے پیغمبر! ہم نے تمہیں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے

آیت پر بار بار غور کیجئے ، مطلب یہ ہے کہ اے نبی ! آپ کو ہم نے دنیا میں اس لئے بھیجا ہے کہ لوگ آپ کی تعلیم پر عمل کر کے (صالحین) زمین کا اقتدار بدوں سے چھین لیں ۔ برائی اور گناہ کے غلبہ کو مٹا دیں ۔ نیکی اور عدل کا غلبہ قائم کر دیں ۔ جب یہ ہو جائے گا تو چار دل طرف امن و خوشحالی کا دور دورہ ہو گا ۔ انصاف ہو گا اور محبت ہو گی رات کی نیند ہو گی اور دن کا چین ہو گا ۔ ——— اور یہی آپ کی رحمۃ للعالمینی ہے ——— اور یہی وہ روح پرور منظر ہے جس میں آپ کی رحمۃ للعالمینی بے حجاب نظر آتی ہے ———

اور سب کو نظر آتی ہے۔ مخالف بھی دیکھتا ہے۔ اور موافق بھی اعتراف کرتا ہے، ــــــ کیونکہ دعا، واستغفار کا تعلق مسلمانوں کی انفرادی زندگی سے ہے، اور عدل و انصاف کی حکومت کا تعلق نوع انسانی کی اجتماعی زندگی سے ہے، رحمتیں دونوں ہیں لیکن دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

زمین سے کون سی زمین مراد ہے؟

بعض مفسرین نے "ان الارض" میں زمین سے مراد جنت کی زمین لی ہے تاہم اس سے ہمارا مطلب بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح درست نہیں، کہ صرف جنت کی زمین مراد لی جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا اور جنت دونوں کی زمین مراد ہو، ابن کثیر نے یہی تفسیر اختیار کی ہے، اور اس کی تائید میں حسب ذیل دو آیتیں پیش کی ہیں:۔ مومن ۵ میں فرمایا۔

(۱) إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ — ہم اپنے رسولوں اور ایمانداروں کی امداد کریں گے دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی جس دن گواہ قائم ہوں گے۔

یعنی دنیا کی زندگی میں مادی غلبہ عطا فرمائیں گے اور آخرت کی زندگی میں روحانی کامیابی اور سعادت۔!

(۲) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا۔

خدا تعالیٰ ایمان و عمل والے انسانوں سے وعدہ کر رہا ہے کہ وہ انہیں زمین کی خلافت دے گا جیسا کہ ان سے اگلوں کو عنایت کی تھی، اور انکے اس دین کو غلبہ عنایت کریگا جس دین سے وہ راضی ہوگیا ہے اور ان کی زندگی کے (اقتصادی، سیاسی، اور اخلاقی) خوف و خطرہ کو امن سے بدل دیگا۔ یہ وہ لوگ ہونگے جو صرف میری غلامی (عبادت) کرتے ہونگے اور میرے ساتھ کسی دوسرے کو اپنا حاکم و معبود نہ بنائینگے۔

ہم بھی ابن کثیر کی رائے سے متفق ہیں۔ اور یہ مانتے ہیں کہ "ارض" سے جنت اور دنیا دونوں کی وراثت ارضی مراد ہوسکتی ہے لیکن اگر صرف دنیا کی زمین مراد لی جائے تب بھی جنت کی وراثت ضمناً اس کے ساتھ آجاتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی جائز کامیابی کے ساتھ آخرت کی سرفرازی لازم ہے۔ اور جنت کی زمین انہی لوگوں کا حق ہے جو خدا کی زمین کو ظالموں سے چھین کر عدل و خدا پرستی کی فرمانروائی میں لے آتے ہیں۔ اور اس عظیم الشان نیکی کے لئے جان و مال کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے

پس "رحمۃ للعالمینی" یہ ہے کہ اسوہ رحمت کی فرمانروائی ہو اور

نظامِ رحمت کے ماتحت مسلمان دنیائے انسانیت کے خادم بنکر رہیں ؎

سروری در دینِ ما خدمت گریست　　عدلِ فاروقی و فقرِ حیدریست

آن مسلماناں کہ میری کردہ اند　　در شہنشاہی فقیری کردہ اند

موجودہ تہذیب کی منزل

تم ہی بتاؤ کیا گاڑی اسی سمت نہیں چلا کرتی جس طرف گاڑی کا ڈرائیور اسے لے جانا چاہتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں سفر کرتے ہیں وہ چاہیں یا نہ چاہیں بہرحال اسی طرف سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ——

النّاس علیٰ دینِ ملوکھم　　کے مقولہ کا یہی مطلب تو ہے،

اکبرؔ نے کہا ہے ؎ محلِ طعن نہیں ہے ہماری مے خواری

ہنر کے حکم میں ہیں عیب بادشاہ پسند

موجودہ تہذیب کا رُخ کس طرف ہے؟ ——

مسز جارج ایلین اینڈا نون اپنی کتاب " جنس تمدن " میں لکھتا ہے۔

—— " موجودہ تمدن کا سارا لب لباب منافقت ہے، لوگ اپنا عقیدہ خدا پر ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن اپنی جانیں تک مال پر قربان کرتے رہتے ہیں —— عزت کے الفاظ عصمت کے متعلق استعمال کئے جاتے ہیں لیکن زندگیاں حرام کاری اور آتشک کے لئے وقف ہیں، زبان سے سچائی کی داد دیتے ہیں لیکن عملاً اقتدار کی

کرسیوں پر بددیانتوں ہی کو بٹھائے ہوئے ہیں، (سیچ صفحہ ۶ و ۱۹۳۰ء)

اب بتائیے کہ اس ماحول میں "رحمۃ للعالمینی" کی صحیح تصویر کہیں نظر پڑ سکتی ہے۔ مسلمان بھی کیسے بھولے ہیں چاہتے ہیں کہ گاڑی تو رہے ڈرائیور ہی کے قبضہ میں مگر چلے وہ ہماری سمت پر،

نہیں ایسا نہیں ہوگا، اگر مسلمان رحمت اللعالمین کے سچے نام لیوا ہیں تو پھر انہیں قیادتِ عالم کے منصب سے بے دینوں اور ظالموں کو دھکا دے کر اسے نیکوں کے قبضہ میں لانے کے لئے جان و مال کی آخری قربانی کا فرض ادا کرنا پڑے گا۔

جہاد اور رحمت

رحمۃ للعالمین صرف کوئی "عاشقانہ نعرہ" نہیں ہے، اس میں عمل و قربانی کی دعوت پوشیدہ ہے، سورۃ انبیاء کی اوپر والی آیت کے ساتھ ذرا اس حدیث پر بھی غور کیجئے۔

ان الله بعثنی رحمة مهداة بعثت برفع قوم وخفض آخرين (رواه الحاکم)

مجھے خدا تعالیٰ نے قابلِ اتباع رحمت بنا کر بھیجا ہے، میں اس لئے آیا ہوں تاکہ میرے ذریعہ (نیک) قوم بلند ہو اور (بری) قوم پست ہو۔

مسلمانوں کو تو یہ پڑھایا جا رہا ہے کہ "جہاد" فتنہ ہے اور فساد ہے اور "قربانی" خود کشی ہے ذرا دیکھیے اس دو رُخی [illegible] کیا آپ کو "رحمت" کہا ہے

والذی نفسی بیدہ لا قتلنھم ولا صلبنھم ولا ھدیتھم وھم کارھون انی رحمۃ بعثنی اللہ ولا یتوفانی حتی یظھر اللہ دینہ (طبرانی عن جبیر ابن مطعم)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں دشمنانِ حق کو ضرور قتل کروں گا اور ضرور انھیں سولی پر چڑھاؤں گا۔ چاہے وہ کتنا ہی ناپسند کریں یا پھر وہ راہِ راست پر آجائیں کیونکہ میں رحمت بن کر آیا ہوں، مجھے خدا وفات نہیں دے گا جب تک کہ اس کا دین غالب نہ ہو جائے۔

تہذیب افرنگ کے آخری سانس

کوئی وقت جا رہا ہے کہ تہذیب حاضر مع اپنے پرستاروں کے آگ اور خون کے سمندر میں غرق ہونے والی ہے۔

اقبال کہتا ہے ؎ خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

یورپ کی پہلی اور دوسری عظیم ترین ہولناک لڑائیوں نے تہذیب مغرب کی جڑیں بالکل کھوکھلی کر دی ہیں۔ اب قدرت صرف اس بات کی منتظر ہے کہ کوئی قوم عدل و انصاف اور اخلاق کی صلاحیتوں سے آراستہ ہو کر آگے بڑھے اور اس بارِ عظیم کو اٹھانے کی اہلیت کا ثبوت دے تاکہ قوموں کی قیادت کا منصب اسکے حوالہ کر دیا جائے ـــــــ مسلمان اس امانت کے اصل حق دار ہیں لیکن اگر وہ بے عملی، بے حیائی اور بد اخلاقی کی اسی راہ

پر قائم ہے، جس پر یورپ چل رہا ہے، تو پھر جو قوم بھی یورپ کی ظالم قوموں اور ان قوموں کے اندھے مقلدین سے نسبتاً بہتر ہو گی۔ یہ امانت اسی کے حوالہ کر دی جائے گی کہ یہی قدرت کا آئین اور دستور ہے۔

اُمت کے صبر کی آزمائش

حدیث ابو ہریرہ رضؓ کی تشریح میں چند باتیں درمیان میں آ گئی تھیں، اصل گفتگو اس میں تھی کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کیوں ہوئی؟ حدیث ابو ہریرہ رضؓ میں تو حضور نے خود ہی اس کی وجہ بیان فرما دی کہ میری وفات "رحمت" ہے، تاکہ میں تم سے پہلے جا کر تمہارے لئے دعاء و استغفار کروں ــــــــ اس کے علاوہ چند وجوہ اور بھی بیان کئے گئے ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مسلمانوں کو تیئیس سال تک ہر مصیبت میں صبر و ثبات کی تعلیم دی تھی۔ ان کے صبر کو آزمانا تھا، محبوبِ اعظم کی جدائی امت کے لئے ایک عظیم ترین مصیبت تھی، دنیا نے دیکھ لیا کہ اس مصیبت میں مسلمانوں نے وہ صبر و استقلال اختیار کیا جس کی نظیر تاریخ مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہے۔

خدا پرستی کا امتحان

دنیا کو یہ بھی دکھانا مقصود تھا کہ محمد رسول اللہ نے مسلمانوں کو خدائے واحد کی ذات کا

پرستار بنایا ہے، اپنی شخصیت کا پجاری نہیں بنایا
چنانچہ صحابہ کرام جس طرح اپنے رسول کی موجودگی میں خدا پرستی اور اسلام کے علم بردار تھے اسی طرح آپ کے بعد بھی رہے، اگر حضورؐ دنیا سے پردہ نہ فرماتے تو خالص خدا پرستی کا یہ وصف کیسے نمایاں ہوتا۔

حضورؐ پر اتمام نعمت

حضورؐ کے دنیائے فانی سے حظیرۃ القدس کی طرف تشریف لے جانے کی ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ آپ پر خدا کے انعامات کی تکمیل ممکن نہ تھی جب تک کہ آپ کو حق تعالیٰ اپنے پاس نہ بلاتا، ——— حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کائنات ہستی میں وہ تنہا ایک انسان ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کی بندگی کا سب سے زیادہ حق ادا کیا ہے، نہ انسانی خدمت میں آپ کی نظیر ممکن ہے نہ عبادت الٰہی میں آپ کی مثال مل سکتی ہے۔

حد ہے کہ حق تعالیٰ کو خود یہ کہنا پڑا

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ۔	اے کمبلی اوڑھنے والے! رات کو جاگئے مگر تھوڑا، آدھی رات یا اس سے کم یا کچھ زیادہ۔
طٰهٰ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ	اے نبی! ہم نے آپ پر اس لئے قرآن نازل

الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی۔ نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔

لوگوں کے راہ راست پر نہ آنے سے آپ کی رنجیدگی کا یہ عالم تھا

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ سو شاید آپ ان کافروں کے پیچھے مارے غم کے اپنی جان دیدینگے؟ اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائے۔

عصمت کے باوجود عبادت کا حال

سورہ فتحنا میں عصمت اور عفو عام کا اعلان ہوتا ہے، چاہیئے تھا کہ اب تو ریاضت میں کمی کر دیجاتی مگر عبادت اور شب بیداری کا وہی عالم رہا ——— صدیقہ رضہ نے جب اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا

اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا عائشہ! کیا میں اپنے رب کا شکرگزار بندہ نہ ہوں۔

یعنی یہ اعلان ——— لِيَغْفِرَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ——— خدا تعالیٰ کا احسان عظیم ہے، جس پر مجھے اور زیادہ شکر کرنا چاہیئے۔ نہ یہ کہ میں سست اور ناشکرا بنکر بیٹھ جاؤں۔

اب آپ ہی بتایئے کہ اس خدمت و عبادت کا اجر کیا اور کتنا ہو سکتا ہے ——— ؟ اور کیا وہ اس فانی زندگی میں پورا ہو سکتا ہے ——— ؟ جبکہ یہ عالم فانی معمولی اعمال کی پوری جزاو سزاء دیئے جانے کا بھی متحمل نہیں ——— اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس عالم میں اجر و ثواب لینا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے جناب سے یہ فرمایا تھا۔

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ — اے نبی آپ کا آخر آپ کے اول سے بہتر ہے ،

جب حضرت عمر رضؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چٹائی پر لیٹے ہوئے دیکھا ، اور ان نشانات سے متاثر ہو کر جو آپ کی پشت پر پڑ گئے تھے یہ کہا ، سرکار! —— خدا سے دعا کیجئے کہ وہ دنیا کی اس تنگی کو دور کر دے ، دیکھئے قیصر و کسرےٰ کی کیا حالت ہے —— !

تو غصّہ کے مارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا ، اور تکیہ کا سہارا چھوڑ کر اٹھ بیٹھے ، اور فرمایا ——
عمر! تو نے مجھے قیصر و کسریٰ پر قیاس کر لیا ، میں نے تو اپنے صلہ کے لئے آخرت کی زندگی اختیار کر لی ہے ، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی ،

اس عالم میں آپ پر انعامات کی تکمیل کیوں ممکن نہیں ہے —— وجہ یہ ہے کہ آپ کے مراتب ہر لمحہ ترقی پذیر ہیں ، یہ عالم محدود اور فانی ہے ، اور اس قدر تنگ ہے کہ نہ اس میں

"رفعت ذکر" کا وعدہ پورا ہو سکتا ہے نہ "اعطاء کوثر" کا۔

(۱) اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ — ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی ہے

(۲) وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ — اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا ہے

یہاں جو کچھ ملا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو آگے ملے گا اور ملتا رہے گا ــــــ نیز جو بلندی آپ کو اس عالم میں عطا ہوئی ہے وہ وعدہ الٰہی کی صرف ایک جھلک ہے، ــــــ ورنہ ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جبکہ آپ "لواء حمد" کے علم بردار ہوں گے، اور خدا تعالیٰ کی پوری وفادار کائنات ــــــ اولین و آخرین ــــــ انبیاء و اولیا ــــــ سب اس کے نیچے ہوں گے ــــــ یہ ہوگا "رفعت ذکر" کا شاندار مظاہرہ، اور وہ ساعتیں جن میں، ساقی کوثر، حوض کوثر پر کھڑے ہو کر ــــــ فیض عام کے دریا بہا رہے ہوں گے۔ یہ وہ منظر ہوگا جسے ــــــ اعطیناک الکوثر ــــــ کا ایک ادنیٰ مظاہرہ کہیے ــــــ حق تو یہ ہے کہ ان انعامات کی نہ کوئی انتہا ہے نہ اختتام جو انعامات حق تعالیٰ اپنے "بندۂ خاص" پر نازل فرمائے گا ــــــ

"فلھم اجر غیر ممنون" ــــــ

آپ کی ترقی کے لئے اس عالم کی وسعتیں ناکافی تھیں

دوسرے الفاظ میں مختصراً یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس تیز رفتاری کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحانی ترقی فرما رہے تھے جب تک یہ مادی عالم اس کا متحمل رہا اور آپ کی ترقی اسی رفتار سے جاری رہی جو اس انسانِ کامل کے لئے مقدر تھی اس وقت تک آپ اِس عالم میں زندہ رکھے گئے اور جب اِس عالم کی محدود وسعتیں ناکافی ہوگئیں تو ضروری ہوا کہ آپ کو اس عالم محدود سے عالمِ غیر محدود کی طرف منتقل کر دیا جائے ؛ ———

رہی اس بات کی تعیین و تفصیل کہ آخر آپ کی تیز رفتاری کا ایسا کیا حال تھا جو یہ عالم اس کے لئے کافی نہ ہوسکا ——— ؟ تو کہاں ہمارا علم و ذہن اور کہاں حضورؐ کی وہ ترقی ——— ! ہاں واقعہ معراج اس کی طرف کچھ اشارہ کر سکتا ہے، کہ جس نے ایک معمولی جست میں زمین و آسمان کی تمام وسعتوں کو طے کر لیا اور جبرئیلؑ بھی ساتھ نہ چل سکے تھک کر بیٹھ گئے اس ذات کی روحانی ترقیوں کو اسی سے سمجھ لیجئے

حضورؐ کو اپنی وفات کا کب علم ہوا ——— ؟

پہلی اطلاع | حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفات کا علم کب ہوا ؟

اس کے متعلق اصحاب سیر کے اقوال مختلف ہیں —— بہتر یہ ہے کہ اس بحث میں پڑے بغیر راجح قول پیش کر دیا جائے ——

حضرت جبریل کا یہ معمول تھا کہ وہ بحکم الٰہی ہر سال رمضان شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کا دور فرمایا کرتے تھے ۱۰ھ ہجری کے رمضان میں حضرت جبریل نے ایک دفعہ دور کرنے کے بجائے دو مرتبہ دور کیا —— (جس سے آپ نے یہ سمجھا کہ اب میری وفات قریب معلوم ہوتی ہے اور مجھے دوسرا رمضان میسر ہوتا نظر نہیں آتا —— حقیقت بھی یہی تھی) تاکہ ناسخ و منسوخ، ترتیب آیات، اور سورتوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے اور اس کے مطابق آپ امت کو ہدایات دیے جائیں —— مگر نہ آپ نے کسی سے اس کا اظہار کیا اور نہ آپ کو یقین ہی تھا۔ بلکہ یہ واقعہ صرف ایک اشارہ تھا۔ چنانچہ وفات کے بالکل قریب حضرت فاطمہ رض سے آپ نے یہ بات کھولی تھی کہ میں نے رمضان ہی میں یہ گمان کیا تھا جس کی بعد کے واقعات نے تصدیق کر دی۔

تکمیل دین کا اعلان

دوسری اطلاع	صحیح قول کے مطابق ۹ھ ہجری میں حج فرض

ہوا ہے، آپ نے فرضیت حج کے بعد ۱۰ھ ہجری میں حج ادا فرمایا، جو ہجرت کے بعد آپ کا آخری اور پہلا حج ثابت ہوا اسی حج کے موقعہ پر مقام عرفات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار تھے کہ آپ پر وحی کے آثار شروع ہو گئے، اور آپ نے یہ آیت پڑھ کر لوگوں کو سنائی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔	مسلمانو! آج تمہارے لئے تمہارا دین مکمل ہو گیا ہے اور میں نے آج تم پر اپنی نعمت کامل کر دی ہے اور میں نے تمہارے لئے "اسلام" کو بطور ایک دین کے پسند کر لیا ہے۔

"تکمیل دین کے اس اعلان نے تمام صحابہ کرام میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی، کہ تیئیس سال تک جس "نعمت" کے لئے ماریں کھائیں، خون بہایا، گھر سے بے گھر ہوئے آج وہ نعمت دشمنانِ اسلام کے علی الرغم مکمل کر دی گئی ہے، —— لیکن خوشی کی اس عام فضاء میں کیا دیکھا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ایک طرف بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں، خوشی کے اس موقعہ پر —— جس کے متعلق یہود یہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے ہاں یہ آیت نازل ہوتی تو ہم اس دن کو "یوم العید" کے طور پر مناتے —— یہ رونا کیسا، —— ؟

ہوسکتا ہے کہ بعض نوجوان صحابہ نے ابوبکرؓ کے رونے کو برا سمجھا ہو، لیکن جو حضرات ابوبکرؓ کی دور رس طبیعت کو جانتے تھے وہ آپ کی طرف متوجہ ہو گئے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ابوبکرؓ محرم اسرار نبوت ہیں، ان کا رونا بے وجہ نہیں ہو سکتا۔

صحابہ نے ابوبکرؓ سے رونے کی وجہ دریافت کی، فرمایا۔ تکمیل دین کے اعلان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پوشیدہ ہے، ——— جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوبکرؓ کے اس اجتہاد کا ذکر کیا تو آپ نے ان کی تائید کی۔ (صحیحین)

لیکن ابھی تک آپ نے اسے صرف اشارہ ہی سمجھا، اور یقین کا درجہ نہ دیا۔ کیونکہ خطبہ غدیر خم میں جب آپ نے اپنی وفات کا اعلان فرمایا تو آپ کے الفاظ یہ تھے۔۔

یوشک ان یاتینی رسول ربی فاجیب	شاید میرے پاس میرے رب کا قاصد یعنی ملک الموت آئے اور میں اس کی دعوت قبول کر لوں۔

تیسری اطلاع

مرض الموت شروع ہونے سے پہلے ایک روز نبی اکرم علیہ التحیۃ والتسلیمات شہدائے احد کی قبروں پر تشریف لے گئے، اور ان سے اس طرح رخصت ہوئے جس طرح ایک جدا ہونے والا نہایت حسرت ناک انداز سے اپنوں

سے ملتا ہے، اور رخصت ہوتا ہے، اس کے بعد آپ مسجد نبوی میں ممبر پر تشریف لائے اور صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا، ———

"لوگو! میں تم سے پہلے جاتا ہوں کہ حوض کوثر وغیرہ کا انتظام پہلے سے کر رکھوں، واللہ میں یہاں سے حوض کو دیکھ رہا ہوں" (اصح السیر)

اس خطبہ سے یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس خطبہ کے وقت آپ کو اپنی وفات کا علم ہو گیا تھا۔ جب خدا تعالیٰ نے آپ کو وفات کے متعلق صاف بتا دیا تب آپ نے اس کا اعلان کرنا شروع کیا۔

چوتھی اطلاع ابن ابی حاتم کی ایک روایت کے مطابق جو ابن عباس سے مروی ہے۔ سورۃ ———

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ ——— وفات سے صرف ۹ روز پہلے نازل ہوئی ہے۔ جب یہ سورۃ اتری تو آپ نے فرمایا۔

نُعِیَتْ اِلَیَّ نَفْسِی (احمد) ۔ اس میں مجھے میری وفات کی خبر دی گئی ہے

سورۃ کا مفہوم یہ ہے ——— "اے نبی! جب خدا تعالیٰ کی نصرت اور فتح آگئی اور آپ لوگوں کو دیکھ رہے ہیں کہ جوق در جوق دین میں داخل ہو رہے ہیں (تو رسالت کا مقصد پورا ہو گیا جس کے لئے آپ دنیا میں تشریف لائے تھے) لہٰذا اب آپ میری پاکی اور حمد بیان کیجئے، اور خدا تعالیٰ سے استغفار کیجئے بیشک وہ توجہ فرمانے والا ہے۔

عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں ——— " اس سورت کے بعد آپ نے " امر آخرت " میں خوب جد و جہد شروع کر دی - اور آپ اٹھتے بیٹھتے بکثرت ——— سبحان اللہ وبحمدہٖ ——— پڑھنے لگے۔

کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گناہ گار تھے جو استغفار کا حکم ہوا ——— ؟ یہ بات تو آپ کے تصور پر بھی گراں ہو گی کہ نبی اکرم کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تھے۔ نہ بطور خود ——— بلکہ خدا کا حکم تھا کہ آپ اپنے لئے دعاءِ مغفرت کیا کریں، پھر کیا یہ اس لئے کہ معاذ اللہ آپ گناہ گار تھے ——— ؟

یہ سوال واقعی حل ہونا چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق جب حضرت حق نے گناہوں سے عصمت کا اعلان فرمایا ہے تو پھر انہیں استغفار کا حکم کیوں دیا گیا ہے، جب گناہ نہیں تو گناہوں کا معاف کرانا کیسا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ — اور وہ خدا جس کی ذات سے میں امید کرتا ہوں

خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ — کہ جزاء کے روز میری بھول چوک معاف کر دے گا۔

انجیل لوقا میں مسیح کا قول

حضرت مسیحؑ کو جب ایک شاگرد نے "نیک استاد" کہہ کر پکارا ہے تو میں

ان کے جواب میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ ——— "تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے۔ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸-۱۹)

حضرت عیسیٰؑ کی ایک مشہور دعا میں یہ الفاظ ہیں۔

"اور جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو بخشتے ہیں تو اپنے دین ہم کو بخش دے۔" (متی-۶-۱۲)

استغفار کی دو ماثور دعائیں

حضرت ابو ہریرہ رضؓ اور حضرت عائشہ رضؓ نے حضورؐ کی دو دعائیں نقل کی ہیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ سردار دو جہاں اپنے رب سے کن الفاظ کے ساتھ بخشش و کرم کی دعائیں مانگتے ہیں گناہوں سے پاکی اور پھر اظہار عجز و قصور کا یہ حال ——— ! حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں یہ دعا فرمایا کرتے تھے

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ کُلَّہٗ دِقَّہٗ	اے اللہ! میرے تمام گناہ
وَجِلَّہٗ وَاَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ وَ	معاف کر دے چھوٹے اور بڑے
عَلَانِیَتَہٗ وَسِرَّہٗ ۔ (مسلم)	اگلے اور پچھلے کھلے اور چھپے۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں ایک روز میں نے رات کو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے یہ دعا پڑھ رہے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ	الٰہی! میں تیرے غضب سے تیری رضامندی

سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ ۔ (مسلم)

کی پناہ میں آتا ہوں اور تیرے مواخذہ سے تیرے عفو کثیر کی پناہ میں آتا ہوں غرضیکہ تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں میں تیری وہ حمد وثنا نہیں کرسکتا جو تو نے خود اپنی ذات کی کی ہے۔

بیہقی کی روایت میں اتنا اور ہے کہ حضورؐ نے صبح اٹھ کر حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا ــــــ "جبریلؑ نے آکر مجھے یہ دعا تعلیم کی اور کہا ــــ آپ اسے اکثر پڑھا کیجئے۔

پہلی توجیہ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بندہ خواہ وہ کتنا ہی اطاعت کیش اور وفادار ہو تاہم اسے اپنے آقا کے سامنے سرنگوں، عاجز، اور نادم ہی ہونا چاہیئے ــــ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو یہ طرزِ عمل اس "غلام" کا نقص نہیں۔ اس کی عبدیت کا کمال ہے، جس سے زیادہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کوئی شئی پسندیدہ نہیں۔

اسی طرح اگر خدا تعالیٰ اپنے کسی "کامل بندہ" کے متعلق یہ فرماتا ہے کہ ــــــ "میں نے تجھے معاف کیا۔ تیرے گناہ بخشے" ــــــ تو یہ اعلان اس پیغمبر کی گناہ گاری کا ثبوت نہیں۔ خدا

کی طرف سے اس کی پسندیدگی اور قبولِ تام کی بشارت ہے، سورہ فتحنا میں حضورؐ کے اگلے اور پچھلے گناہوں کی معافی کا اعلان اسی معنی میں ہے۔

دوسری توجیہ

دوسرا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جب انبیاء علیہم السلام کو استغفار کا حکم دیتا ہے تو در اصل انہیں اس بات پر تنبیہ کرنی مقصود ہوتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر قناعت نہ کریں بلکہ ترقی کی طرف اور تیزی سے قدم اٹھائیں ظاہر ہے کہ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہر پچھلے مرتبہ کو تقصیر سمجھ کر اس سے نکلنے کی کوشش نہ کی جائے۔

پس جب "تقصیر" کا تصوّر پیدا ہو گا تو استغفار کیا جائے گا ——— یہی حق تعالیٰ کا مقصد ہے۔ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام جس قدر مراتب فضل و شرف میں ترقی کرتے جاتے ہیں اسی قدر استغفار میں کثرت ہوتی جاتی ہے، اور حضور خداوندی میں عجز و نیاز بڑھتا جاتا ہے، ——— آخر وقت میں سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ اذا جاء میں استغفار کا حکم دینا اسی غرض کے لیے ہے۔

مرضِ وفات کی ابتدا

اس بارے میں بھی تاریخی روایات مختلف ہیں کہ حضور کس تاریخ کو بیمار پڑے۔ اور مرضِ وفات کی ابتدا کس زوجۂ محترمہ کے گھر میں ہوئی؟ اور

آپ کتنے دن بیمار رہے ؟ —— ہم آپ کے سامنے وہ قول پیش کرتے ہیں۔ جسے شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے ما ثبت بالسنۃ میں اختیار کیا ہے۔

سردار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس آکر صفر کے آخر ایام تک تندرستی کے ساتھ امت کے امور مہمہ انجام دینے میں مشغول رہے۔

مرض کیوں کر شروع ہوا

اتفاق سے آپ صفر کی آخری تاریخوں میں ایک صحابی کے جنازہ کے ساتھ بقیع الغرقد تشریف لے گئے۔ جب آپ حضرت عائشہ رض کے مکان پر واپس آئے تو آپ کے سر میں درد شروع ہو گیا۔

اس کو بھی ہم حسن اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حضرت عائشہ رض بھی سر کے درد میں مبتلا تھیں، آپ کو دیکھتے ہی حضرت عائشہ رض نے کہا "ہائے میرا سر" حضور ؐ نے سنکر فرمایا۔

—— بل انا وارا ساہ —— اپنے درد کو چھوڑو، میرے سر کا درد اس سے زیادہ خطرناک ہے۔

حضرت عائشہ سے مزاح

کہنے کو حضور ؐ نے یہ بات کہہ تو دی کہ —— نہیں، بلکہ میرے

درد سر کی خبر ہو ــــــ کیوں کہ واقعہ یہی تھا کہ آپ کا درد سر وفات کا پیغام تھا۔ مگر اس سے حضرت عائشہ کو خیال ہو سکتا تھا کہ حضورؐ نے اپنی عادت کے خلاف مجھے جھڑک دیا، فوراً حضورؐ نے اس کا احساس کیا اور حضرت عائشہ رضؓ کی دل جوئی فرماتے ہوئے مزاحاً کہا

ــــــ " عائشہ (رضؓ)! اگر مجھ سے پہلے تم وفات پا جاؤ تو اس میں تمہارا کیا حرج ہے، بلکہ فائدہ ہی ہے۔" تم کو غسل دوں گا، کفن پہناؤں گا جنازہ کی نماز پڑھوں گا۔ پھر خود دفن کروں گا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے جواب دیا جی ہاں۔ آپ سب کچھ کریں گے۔ مگر یہ بھی تو ہوگا کہ آپ اسی روز میرے گھر میں دوسری بیوی کے ساتھ آرام کریں گے۔ یا رسول اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں آپ پر بار ہو گئی ہوں آپ سن کر مسکرا دیئے۔

شہدائے اُمت کے لئے استغفار

اس روایت کے مطابق تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کی ابتداء ایک صحابی کے جنازہ سے واپسی پر ہوئی، لیکن حضرت ابو موہیبہ رضؓ حضورؐ کے آزاد کردہ غلام حضورؐ کے مرض کی ابتداء کے متعلق ایک دوسرا واقعہ ذکر کرتے ہیں۔

ابو موہبہ کہتے ہیں ــــــ " ایک روز آدھی رات گزرنے کے بعد میرے آقا نے مجھے آواز دی" ابو موہیبہ! میرے ساتھ چلو،

مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اہل بقیع کے لئے دعاء مغفرت کروں ——
میں آپ کے ساتھ چل کھڑا ہوا، قبرستان پہنچے، آپ نے وہاں پہنچ کر فرمایا، —— السلام علیکم یا اھل المقابر ——
اے قبر والو! تم پر سلامتی نازل ہو، تمہاری صبح دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ اچھی ہو، اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے پے درپے آپہنچے ۔"

اس کے بعد حضورؐ میری طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا ——
ابو موہبہ! میرے سامنے دنیا کے خزانوں کی کنجیاں اور دنیا کی دائمی زندگی پیش کی گئی۔ اور اختیار دیا گیا کہ یا اسے پسند کروں یا لقائے الٰہی کو اختیار کروں، ابو موہبہ کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا حضورؐ! خزائن دنیا کو قبول کر لیجئے، فرمایا۔ نہیں۔ میں نے تو جنت اور لقاء الٰہی کو اختیار کر لیا ہے۔ پھر حضورؐ شہداء احد کے لئے دعاء مغفرت کر کے واپس تشریف لے آئے —— اور گھر آ کر درد سر لاحق ہو گیا،"

حضرت ابو موہبہ کے بیان کے مطابق اسی واقعہ کے بعد وہ تمام قصہ پیش آیا ہے۔ جو حضرت عائشہ رضؓ کے متعلق اوپر بیان کیا گیا۔

خوشی میں یاد رفتگان | یہ وہ وقت تھا کہ خدا تعالے نے اپنے

دین کو مکمل کر دیا تھا۔ اور اسلام کے نُور سے شرک کی تاریکی کافور ہو چکی تھی، اپنے مشن میں کامیابی کس قدر خوشی کا باعث ہوتی ہے، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطمینان کی نظر سے اپنی جدوجہد کے نتیجہ کو دیکھا، وہ احباب یاد آگئے جن کی قربانیوں اور موت نے اسلام کو زندگی بخشی تھی۔ دل کہہ رہا تھا، کاش وہ زندہ ہوتے اور آج کی خوشیوں میں شریک ہوکر یہ دیکھتے کہ اسلام کی ضیاء باری سے تمام عرب روشن ہے۔

بس یہ یادِ رفتگان کی بےتابی تھی جس کا اظہار ہو رہا تھا اور خاک میں منہ چھپائے ہوئے دوستوں کے پاس جاکر محبت کی بیتابی کو کم کیا جا رہا تھا۔

اسلام اور خوش طبعی

نبی کا ہر عمل امت کے لئے اسوہ حسنہ ہے۔ نبی اکرم علیہ السلام حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ خوش طبعی سے پیش آتے ہیں جب آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے اس جملہ سے میری رفیقۂ حیات کو صدمہ پہنچا ہے کہ

"اپنا قصہ چھوڑو، میری خبر لو"——!

جو لوگ طبعاً خشک مزاج اور سنگدل ہوتے ہیں وہ اپنی اس ناپسندیدہ طبیعت کو تقوٰی کا رنگ دے کر "اسلامی تقوٰے" کو

بازنام کرتے ہیں۔

اسلام دنیا میں اس لئے نہیں آیا کہ وہ انسان کی فطری خواہشات کو یکسر مٹاکر رکھدے۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ ہر فطری جذبہ سنجیدگی اور تہذیب کے دائرے میں آجائے۔ چنانچہ نبی اکرم روحی فداہ کی عملی زندگی میں بیویوں کے ساتھ ہنسنا بولنا، خوش طبعی کرنا، اور احباب کے ساتھ سنجیدہ مزاح کرنا بکثرت موجود ہے —— دیکھئے! اگر ایک طرف حضرت عائشہ رضؓ یہ فرماتی ہیں، کہ میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ ہنستے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچلیاں کھلی ہوں، تو دوسری طرف حضرت جریر رضؓ ابن عبداللہ رضؓ جنہیں دربارِ رسالت سے "یوسف امت" کا خطاب ملا ہوا تھا فرماتے ہیں ——

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑا ہوں اور حضورؐ مجھے دیکھ کر مسکرا نہ دیئے ہوں۔

حضورؐ کی خوش طبعی کا ایک واقعہ

حضرت ظاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح کا ایک واقعہ مشہور ہے، یہ صحابی حضورؐ کو گاؤں سے ترکاریاں لاکر دیا کرتے تھے، جس کے صلے میں آپ انہیں شہر کی چیزیں دیا کرتے تھے —— ایک روز

حضورؐ منڈی میں پہنچے۔ دیکھا کہ حضرت ظاہرؓ ترکاری فروخت کر رہے ہیں۔ آپ نے حضرت ظاہرؓ کو پیچھے سے جا کر دبوچ لیا انہوں نے چھڑانے کے لئے بہت کوشش کی۔ مگر حضورؐ نے نہ چھوڑا کہیں ظاہرؓ نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ تو میرے آقا سردارِ دوجہاں ہیں۔ —— اب بجائے چھڑانے کے ظاہرؓ نے اپنی پشت کو حضورؐ کے سینہ اقدس سے اور ملانا اور قریب کرنا شروع کر دیا، حضورؐ ہنس دیئے، اور ظاہرؓ کو چھوڑ کر فرمایا —— ظاہرؓ ہمارے "بادی" ہیں اور ہم ان کے "حاضر" ہیں۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ اگر دین داری کے نام پر لوگوں کو نفس کشی اور ترک و تبطل کی طرف نہ بلاتا تو آج تہذیب جدید کو اسلام پر یہ آوازہ کسنے کی نوبت نہ آتی کہ اسلام ترقی کی راہ میں حائل —— اور فطرت کے خلاف ہے۔

لیکن جب ان شیدایانِ مغرب کے سامنے اسلام کی فطری تعلیم اور نبی اکرمؐ کا واضح اسوہ موجود ہے تو انہیں اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اگر وہ اتنی زحمت کے لئے بھی تیار نہیں ہیں تو پھر اسلام کے متعلق گھر بیٹھے فیصلہ کرنا کسی طرح بھی انصاف نہیں کہا جا سکتا، ہاں، وہ اسلام سے یہ توقع نہ رکھیں کہ اسلام عورتوں کو بے پردہ بازاروں میں ہاتھ

ڈال کر ساتھ لئے پھرنے، پارکوں میں بے حیائی کے مظاہرے کرنے اور دیگر حیاسوز تفریحات کی اجازت دے گا۔ کیونکہ اسلام "تفریح اور خوش طبعی" کے نام پر بداخلاقی اور بدتہذیبی کی پرورش کرنے کو تیار نہیں۔

حضورؐ کتنے دن بیمار رہے

جمہور کا قول یہ ہے کہ حضورؐ کل تیرہ۱۳ روز بیمار رہے جن میں آخری سات دن ایسے گزرے کہ ان میں آپ کا مرض شدت اختیار کر گیا اور اس وجہ سے آپ کو صرف حضرت عائشہ رضؓ ہی کے حجرہ میں قیام رکھنا پڑا۔

اس عرصہ میں عبرت و موعظت کے جو جو واقعات پیش آئے وہ بیان کئے جاتے ہیں۔ چونکہ اصحاب سیر نے ان واقعات کو تاریخ وار بیان نہیں کیا اس لئے ہم بھی انہیں بلا قید تاریخ بیان کرنے پر مجبور ہیں۔

ان واقعات و حالات میں آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وصایا اور نصائح نہیں ملیں گے کیونکہ ہم نے ان کے لئے آخر میں ایک مستقل باب قائم کرنا مناسب سمجھا ہے تاکہ حضورؐ کی وہ تمام گراں قدر وصیتیں جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے متعلق

ہیں بجائے منتشر طور پر ملنے کے ایک ہی جگہ مل جائیں۔

بیویوں میں کس حد تک مساوات کا خیال کیا ــــ؟

شدتِ مرض کے آخری سات دن حضورؐ نے صرف حضرت عائشہ رضؓ کے ہاں گزارے ، اور ازواج مطہرات کے ہاں باری باری سونا چھوڑ دیا۔

صورت یہ ہوئی کہ جب آپ کی تکلیف بڑھ گئی اور بے حد کمزوری کی وجہ سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جب آپ ایک بیوی کی باری پوری کر کے دوسری بیوی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دو صحابی حضورؐ کو پکڑ کر لے جاتے اور آپ کے پیر زمین پر رگڑ کھاتے ہوئے جاتے اس نازک حالت تک تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے حقوق میں مساوات کو نبھایا ، مگر کمزوری دن بدن بڑھتی جا رہی تھی ، آخر کہاں تک آپ اس تکلیف کو برداشت کرتے ، ایک سخت بیمار کے لئے ہر روز جگہ بدلنا کچھ آسان کام نہیں ،

پھر اس کے علاوہ ہر بیمار مرض کی گھبراہٹ میں قلبی طمانیت چاہتا ہے ، گو آپ کی تمام پاک بیویاں آپ پر جان دیتی تھیں ، اور آپ کی خدمت کو اپنے لئے باعثِ فخر و نجات یقین کرتی تھیں ، مگر اس دلی رجحان کا کیا کیا جائے جس میں انسان حقیقۃً بے بس ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رض کے ہاں رہنے کی خواہش

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ قلبی تعلق حضرت عائشہ رض کے ساتھ تھا اس لئے آپ مرض کی گھبراہٹ میں اکثر فرمایا کرتے تھے

این انا غداً ——— میں کل کہاں جاؤں گا ” ———

آپ کے اس بار بار سوال کرنے سے ازواج مطہرات سمجھ گئیں کہ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم حضرت عائشہ رض کی باری کے متلاشی رہتے ہیں۔ آپ کی اس دلی خواہش کو سمجھ کر ازواج مطہرات نے حضورؐ سے درخواست کی کہ حضورؐ اپنے بقیہ ایام مرض حضرت عائشہ رض کے ہاں گزار دیں ہم سب اس سے متفق ہیں، جب ازواج مطہرات نے خود یہ پیشکش کی تب حضورؐ نے اسے قبول فرمایا۔

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں ” اس کے بعد جب حضورؐ میرے حجرہ میں تشریف لائے تو آپ حضرت عباس رض اور حضرت علی رض کے کندھوں پر ٹیک لگائے ہوئے تھے اور آپ کے پیر زمین سے رگڑ کھا رہے تھے۔

مجلس اقوام متحدہ اور تعدد ازواج

زندگی کے آخری ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

بیویوں کے حقوق میں اس درجہ مساوات پر قائم رہ کر اس حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے کہ اسلام "تعداد ازواج" کے لئے "عدل" کی شرط لگاتا ہے ـــــــ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ ـــــــ یعنی ایک سے چار تک عورتوں کو اپنے نکاح میں لانے کی اجازت ہے، لیکن اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ تم عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر صرف ایک ہی سے نکاح کرو۔

اس شرط کے ساتھ تعدد ازواج کی اجازت نہ صرف یہ کہ عقلاً جائز ہو جاتی ہے بلکہ بعض حالات میں یہ اجازت ایک تمدنی اور اخلاقی ضرورت کے طور پر لازم ہو جاتی ہے ـــــــ لیکن مسیحیت زدہ مغرب ہمیشہ سے تعدد ازدواج کی اجازت پر معترض ہے

چنانچہ ابھی حال میں مجلس اقوام متحدہ کی سب کمیٹی نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں مجلس مذکور کے نام ایک یادداشت ارسال کی ہے جس میں سفارش کی گئی ہے کہ مرد کو ایک عورت کے سوا دوسری عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہ ہو، اور زنا کاری قطعاً مسدود کردی جائے ؎

واقعہ یہ ہے کہ انسان جب خدا کے قانون سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کے لئے دستور بناتا ہے تو وہ اسی قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے، اس سب کمیٹی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ثانیہ

اور امریکہ میں جہاں مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی ہے (چنانچہ اسکول آف اکنامکس لندن کی تحقیقات کے مطابق صرف برطانیہ میں مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد تیں لاکھ زیادہ ہے) زناء کی روک تھام کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ ——

جب آپ ایک مرد کو صرف ایک ہی عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت دیں گے تو باقی عورتیں اپنی ضرورت پورا کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کریں گی —— یا پھر یہ کہئے کہ عورت خلاف فطرت نفس کشی اختیار کرے۔ لیکن کیا یورپ کی عورت کے لئے یہ ممکن ہے؟ —— لاتعداد سینماؤں اور بے پناہ فحش لٹریچر عریاں تصویروں اور حیا سوز گانوں کی موجودگی میں —— !

فرانس کی ایک خاتون کا اعتراض

سب کمیٹی کی ان سفارشات پر اعتراض کرتے ہوئے فرانس کی ایک خاتون نے یہ کہا ہے ——

"میں اس تجویز سے متفق نہیں ہوں کیونکہ فرانسیسی نوآبادیات میں کئی کئی عورتوں سے شادی کرنے کا رواج اب تک موجود ہے"۔

ہم ان معترضہ صاحبہ سے گزارش کریں گے کہ وہ اس طریقہ سے یورپ کو تعدد ازواج کی ضرورت سے متفق کرنے میں کامیاب

نہیں ہو سکتیں ۔ اس کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مجلس اقوام سے پر زور مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی سفارش کے مطابق یورپ میں حرام کاری کے خلاف جد و جہد کر کے اس کا انسداد کرلے (جو اگرچہ ان حالات میں ناممکن ہے) جب حرام کار مردوں کا وجود باقی نہ رہے گا تو پھر انہیں خود محسوس ہو گا کہ عورتوں کی عددی کثرت کو جائز طریقہ سے کہاں کھپایا جائے ———

لیکن جب تک یہ شوقیہ اور پیشہ ورانہ حرام کاری یورپ کے اندر موجود ہے اس وقت تک یورپ والے تعدد ازدواجی کی ضرورت کو محسوس نہیں کر سکتے ۔ ———

پس اگر حرام کار مردوں اور عورتوں کی طرف سے، تعدد ازواج پر اعتراض ہوتا ہے تو ہمارے لئے افسوس کی کوئی وجہ نہیں ——— تعجب تو ان مسلمانوں پر ہے جو یورپ کی اندھی تقلید میں مبتلا ہو کر اسلام پر منہ آتے ہیں ۔ اور تعدد ازواج کو خلاف تہذیب کہتے ہیں ——— اور پھر وہ مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے رہنما ۔

حضورؐ کو حضرت عائشہ سے محبت کیوں تھی ؟

جن لوگوں کو حرام کار اور نفس پرست یورپ پر اعتماد ہو گا وہ تو اس معاملہ کو شبہ کی نظروں سے

دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن تاریخ کا ایک انصاف پسند طالب علم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ " دین حق کے مبلغ کی دلی توجہ تمام ازواج مطہرات میں صرف حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ اس لئے تھی کہ حضرت عائشہ رضؓ علمی اور اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام بیویوں میں ممتاز تھیں — یقیناً ایک صاحب نظر استاد اس شاگرد کو اپنی توجہ کا زیادہ مستحق سمجھتا ہے کہ جسے وہ دیکھتا ہے کہ منٹوں میں گھنٹوں کی اور گھنٹوں میں دنوں کی راہ طے کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔

مذہبی نقطۂ نگاہ سے تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جس معصوم ذات گرامی کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا ہو ——————

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی —————— تمہارے ساتھی یعنے رسول نہ گمراہ ہوئے نہ بہکے۔ اور جس محترم ذات کی مکمل زندگی کو انسانوں کے لئے قابلِ اتباع اسوہ قرار دیا گیا ہو اس ذات کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی عورت سے صرف اس لئے زیادہ محبت کرتا ہوگا کہ وہ ظاہری حسن وجمال میں ممتاز ہوگی یا مال وجاہ میں اونچی حیثیت رکھتی ہوگی، یہ تو خواہشاتِ نفس کی پرستاری ہے، جس سے انبیاء علیہم السلام کوسوں دور رہتے ہیں۔

یہ صرف مذہبی حقیقت ہی نہیں بلکہ تاریخ کی مسلمہ شہادت ہے"

غور فرمایئے۔ حضرت صفیہ رضؓ ایک یہودی سردار کی صاحب زادی ہیں، حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہیں،

حضرت ام حبیبہ رضؓ مشہور سردار قریش حضرت ابوسفیان کی لڑکی ہیں، جاہ و حشمت کی مالکہ ہیں، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سب میں اگر اپنی توجہ کے لئے منتخب کرتے ہیں تو صرف حضرت عائشہ رضؓ کو۔ کیوں ؟ تاریخ کی شہادت ہے کہ عائشہ نہ صرف ازواج مطہرات پر —— نہ صرف عرب کی عام عورتوں پر بلکہ باستثنائے چند تمام صحابہ کرام پر اپنے علم و فہم اور دیانت اور تقویٰ میں فوقیت رکھتی تھیں۔ یہ بات نہیں کہ خدا کے نبی نے اپنے علوم سے استفادہ کا موقعہ دینے میں کچھ امتیاز برتا ہو۔ نہیں۔ بلکہ سب کو برابر کا موقعہ ملا۔ لیکن حضورؐ کی صحبت سے جو بات حضرت عائشہ رضؓ نے پیدا کی وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔

حضرت عائشہ کا علم و فضل

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ حضرت عائشہ رضؓ کے متعلق فرماتے ہیں۔

ما اشکل علینا اصحاب محمدؐ حدیث قط فسالنا عائشۃ رضؓ الا وجدنا	رسول اللہ کے صحابہ کو کبھی کوئی ایسی مشکل بات پیش نہیں آئی جس کو انھوں نے عائشہ رضؓ سے پوچھا ہو اور عائشہ رضؓ کے پاس اس مسئلہ کے

منعلق معلومات نہ ملی ہوں۔ عندھا منہ علما (ترمذی)

صحابۂ کرام میں ابوموسیٰ رضہ کی شہادت بڑی معتبر شہادت ہے کیونکہ یہ ان چھ بزرگوں میں سے ایک ہیں۔ جن کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی اور کو فتوے دینے کی اجازت نہ تھی۔ (تذکرۃ الحفاظ)

بہرحال محدثین ہوں یا فقہاء، علماء متکلمین ہوں یا صوفیائے کرام۔ علمائے ادب ہوں یا علماء معانی۔ کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عائشہ رضہ کا احسان مند نظر نہ آتا ہو۔

میلانِ قلب پر اظہارِ معذرت

اول تو حضرت عائشہ رضہ کی طرف نبی اکرم روحی فداہ کا جو قلبی میلان تھا وہ کبھی اس حد تک نہیں پہنچا اور نہ پہنچ سکتا تھا کہ، حضور دوسری بیویوں کے حقوق واجبہ میں کوتاہی فرماتے، یا رعائتی حقوق تک میں کچھ تفریق برتتے، لیکن پھر بھی اللہ کے مقدس رسول اس قلبی رجحان پر خداتعالیٰ سے اظہارِ معذرت کرتے تھے۔

اس سے زیادہ اور کیا احتیاط اور تواضع ہوگی کہ غیر اختیاری امر پر بھی خداتعالیٰ کے مواخذہ سے ڈرا جا رہا ہے،

فرماتے ہیں ——— "خدایا! قلب تیرے قبضہ میں ہے"

اگر میرا قلب عائشہ رضؓ کی طرف زیادہ مائل ہے تو اس پر تو مجھ سے مواخذہ نہ کیجیو۔

حضرت عائشہ رضؓ کی کبھی بے جا پاسداری نہیں فرمائی

تاریخ ایک چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی ایسا پیش کرنے سے قاصر ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دلی جھکاؤ کے باوجود دوسری بیویوں کے مقابلہ میں حضرت عائشہ رضؓ کی معمولی سی پاسداری بھی کی ہو۔ سوکنوں کے درمیان کبھی کبھی بدمزگی بھی پیدا ہوتی تھی اور حضورؐ کی خدمت اور محبت میں آگے بڑھنے کے لئے باہمی مسابقت کی نوبت بھی آتی تھی۔ مگر حضورؐ نے کبھی حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ کسی قسم کی ناروا حمایت اور طرف داری نہ کی، اس کے برعکس جب کبھی آپ نے عائشہ رضؓ کی غلطی محسوس کی فوراً انہیں ڈانٹا اور اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

حضرت صفیہ رضؓ بہترین کھانا پکاتی تھیں

حضرت صفیہ رضؓ جو خیبر کے یہودی سردار کی بیٹی تھیں کھانا پکانے میں خاص مہارت رکھتی تھیں ایک روز حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت صفیہ رضؓ دونوں نے ساتھ

ساتھ کھانا پکانا شروع کیا۔ حضرت صفیہ رضؓ نے کھانا جلدی تیار کرلیا اور حضرت عائشہ رضؓ کو دیر ہوگئی، حضورؐ حضرت عائشہ رضؓ کے حجرہ میں تھے ـــــ صفیہ رضؓ نے لونڈی کو بلاکر ایک پیالہ میں حضورؐ کے پاس کھانا بھیج دیا۔ ـــــ حضرت عائشہ رضؓ کو پہلے ہی غصہ آرہا تھا کہ ان کا کھانا ابھی تک کیوں تیار نہیں ہوا، لونڈی کے ہاتھ میں صفیہ رضؓ کا کھانا دیکھ کر اور زیادہ غصہ میں بھر گئیں، اور لونڈی کے ہاتھ سے اسی حالت میں اس طرح گھبراکر پیالہ لیا کہ وہ زمین پر گر پڑا، اور ٹوٹ گیا، ـــــ حضورؐ نے گو منہ سے کچھ نہ کہا، لیکن آپ کے چہرے پر اس حرکت کے خلاف ناراضگی کے آثار نمودار ہوگئے، اور آپؐ بغیر کچھ کہے سنے پیالے کے ٹکڑے چننے لگے، خادمہ سے کہا، تمہاری ماں کو غصہ آگیا ـــــ!

حضرت عائشہ رضؓ سے زیادہ سرکارِ دوجہان کا مزاج شناس کون ہوسکتا تھا ـــــ؟ فوراً تاڑ گئیں۔ اور خود فرمایا حضورؐ مجھ سے غلطی ہوگئی، فرمایئے، اس کا کفارہ کیا ہے، سردارِ دوجہاں نے فرمایا، ـــــ نیا پیالہ منگاؤ اور ایسا ہی کھانا پکاکر صفیہ رضؓ کے پاس بھیجو۔

حضورؐ کے مرض کی شدت

محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم

کے مرض کی شدت کا کیا حال تھا۔ اور آپ نے مرضِ وفات میں کس قدر تکلیف اٹھائی اس کے متعلق صحابہ کرام سے متعدد روایتیں منقول ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضؓ فرماتے ہیں ــــــ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرضِ وفات میں اتنا تیز بخار چڑھا ہوا تھا کہ ایک موٹی چادر کے اوپر سے بھی بخار کی حرارت محسوس ہوتی تھی"۔[1]

حضرت عائشہ رضؓ سے زیادہ اس مرض کی کیفیت سے کون باخبر ہو سکتا تھا، وہ فرماتی ہیں ــــــ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اس قدر شدید مرض میں مبتلا نہیں دیکھا"[2] ــــــ

ــــــ ایک روایت میں آتا ہے، "آپ مرض کی تکلیف اور بے چینی سے بستر پر بار بار کروٹیں لیتے تھے، اور کسی کروٹ آپ کو چین نہ پڑتا تھا، میں نے عرض کیا، حضور! ــــــ اگر ہم میں سے کوئی تکلیف سے اس قدر بے چینی اور بے صبری کا اظہار کرتا تو آپ اس پر ناراض ہوتے، مگر آپ کی یہ حالت ہے"، ــــــ فرمایا، "عائشہ! بے شک مومنوں پر سختی ہوتی ہے"[3] ــــــ یعنی یہ بے صبری نہیں ہے

---

[1] ابن ماجہ [2] صحیحین [3] ماثبت بالسنۃ تصنیف حضرت شاہ عبد الحق دہلوی

تکلیف میں تو طبعاً بے قراری ہوتی ہی ہے۔

بخاری کی ایک روایت میں آتا ہے کہ جب ابن مسعود رضؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے قراری کو دیکھ کر اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا، ــــــ "میرا بخار تم میں سے دو شخصوں کے برابر ہے، اور اسی لئے اس کا اجر بھی دوگنا ہے، اے ابن مسعودؓ ــــــ اگر کسی مسلمان کے پیر میں کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اس تکلیف کو اس مسلمان کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ جس سے اس مسلمان کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں، جس طرح درخت سے سوکھے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

بڑوں پر بڑی مصیبتیں

یہ معاملہ اپنی جگہ بہتوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نیک بندے مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہوتے ہیں، مصیبتیں تو ظالموں اور برے لوگوں کے حصہ میں آنی چاہئیں۔

لیکن قرآن کریم کے فلسفہ کے مطابق اچھوں کو بروں کے مقابلہ میں زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے ان نیک بندوں کو آزماتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ یہ لوگ جو میری محبت کا دم بھرتے ہیں، آیا میری راہ میں پیش آنے والی

مصیبتوں اور مشکلوں کو میرا حکم اور میری مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیل جاتے ہیں یا بے صبری اور بے قراری کا اظہار کرتے ہیں۔

مصائب کی توجیہ میں اہلِ تصوف یہی طریقۂ تعبیر اختیار کرتے ہیں" رہے اہل فلسفہ و قانون تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ــــــــ

یوں تو انسان زندگی کا کوئی راستہ بھی اختیار کرے اسے اس راہ کی مشکلات سے سابقہ پڑتا ہی ہے، پھر زندگی کا مقصد جتنا بلند ہوگا اس کی راہ اتنی ہی زیادہ مصائب کی راہ ہوگی۔ ــــــــ

جب یہ بات ہے تو ظاہر ہے کہ جب حق پرستی اور سچائی کی حمایت (جو اسلام کا خلاصہ ہے) زندگی کے تمام مقاصد میں سب سے زیادہ بلند مقصد ہے تو حق پرستی کے راستہ پر انسان کو بڑی سے بڑی روح فرسا اور صبر آزما مصیبتوں سے سابقہ پڑنا لازمی ہے، ــــــــ

پس جو شخص حوصلہ اور ہمت سے مصائب کا مقابلہ کرنے کا عادی ہوگا وہی اس راہ کی کامیابیوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے، رہے بزدل اور پست ہمت ہونے والے لوگ تو وہ دو ایک قدم چل کر بیٹھ جاتے ہیں ان کے لئے عمل کی کامیابی کہاں؟ ــــــــ

نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ	اچھا ہے بدلہ عمل کرنے والوں کا، یہ وہ لوگ ہیں جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر اعتماد کرتے ہیں۔

آلِ عمران میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَ	مسلمانو! سن لو تمہیں تمہارے مال میں اور تمہاری
اَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ	جانوں میں آزمایا جائے گا اور تمہیں اہلِ کتاب
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ	اور مشرکین کی طرف سے بڑی بڑی تکلیف دہ
وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى	باتیں سننی پڑیں گی (تاکہ تمہارے صبر و استقلال
كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ	کا امتحان ہو سکے) پس اگر تم نے ان کے مقابلہ
تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ	میں صبر و پرہیزگاری کا ثبوت دیا تو یہ بڑی
عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۹)	اولوالعزمی کا کام ہوگا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ التحیۃ والتسلیمات نے ایک حدیث میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

یبتلی الرجل علی قدر دینہ	انسان اپنے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے اگر وہ
فان کان فی دینہ صلابۃ	اپنے دین میں پختہ ہوتا ہے تو اس پر مشکلات بھی
زید فی بلاءہ	زیادہ نازل ہوتی ہیں جن میں وہ آزمایا جاتا ہے۔

نسائی کی ایک روایت میں حضرت حذیفہ رضہ کی بہن فاطمہ بنت الیمان سے حضورؐ کا ایک ارشاد منقول ہے، آپ فرماتے ہیں ــــ "دنیا میں سب سے زیادہ مصیبتیں انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہیں پھر درجہ بدرجہ جن کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ مصیبتوں کے شکار ہوتے ہیں۔

اقبال اور فلسفۂ غم

اقبال کی زبان سے جو فلسفۂ غم ادا ہوا ہے اسے بھی قرآن و حدیث کی تشریح کے ساتھ ساتھ سن لیجئے۔ ؎

آرزو کے خون سے رنگین ہو دل کی داستان — نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے — روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

اسی لئے، انبیاء علیہم السلام کا نغمۂ انسانیت کامل ترین نغمہ ہوتا ہے اور ان کی روح سب سے زیادہ سامانِ راحت سے آراستہ اور ان کا آئینۂ دل سب سے زیادہ شفاف ہوتا ہے، ——— اور یہی وجہ ہے کمال فطرت انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کسی کو نصیب نہیں ہوتا،

مولانا محمد علی جوہر

پیشوایانِ حق سب سے زیادہ مصیبت کیوں برداشت کرتے ہیں ؟

اسے مولانا محمد علی نے جس انداز سے ادا کیا ہے۔ وہ بھی سن لیجئے ———

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

ہے سُنّت اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ
دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو
بطحا کے مسافر کا نقشِ کفِ پا دیکھ

مطلب یہ ہے کہ اگر پیشوایانِ حق کی زندگی میں بڑی بڑی مشکلات پر صبر کرنا اور ہمت سے منزل کی طرف "قدم بڑھانا نہ ہوتا تو پھر پیروانِ حق راہِ حق کی مشکلات کو کیسے عبور کرتے —— مگر —— جب راہِ حق کا ایک مسافر "بطحا کے مسافر" کا نقشِ کفِ پا دیکھتا ہے تو پھر اس کے لئے ہر مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔ ——

میری مصیبت یاد کرو

اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر مصیبت اور تکلیف میں میری مصیبت کو یاد کیا کرو، تمہاری ہر مصیبت آسان ہو جائے گی۔

ایہا الناس! ان احد من الناس	لوگو! اگر تم میں سے کسی شخص پر کوئی مصیبت
اصیب بمصیبۃ فلیعز بمصیبتی	نازل ہو تو اسے میری مصیبت کو یاد کرنا
فان احد من امتی لن یصاب	چاہئے اس لئے کہ میری امت میں کوئی بھی ایسا
بمصیبۃ بعدی اشد علیہ من مصیبتی	نہیں جسے میرے بعد مجھ سے زیادہ تکلیف پہنچے

آنحضرتؐ نے مرض وفات میں علاج نہیں کیا

اگرچہ جسمانی امراض کے دفعیہ کے لئے دواؤں کا استعمال اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے، حدیثوں میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض دواؤں کی تعریف اور بعض امراض کے لئے بعض دواؤں کی تجویز موجود ہے،

شہد کے متعلق حضورؐ کا یہ جملہ مشہور ہے۔ صدق اللّٰہ وکذب بطنک

لیکن مرض وفات میں نبی اکرم نے خود کوئی دوا استعمال نہ فرمائی ـــــ نہ صرف یہ کہ علاج نہیں کیا۔ بلکہ علاج کرنے والوں پر اظہار ناراضگی فرمایا۔ جیسا کہ "لدود" کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

لدود کا واقعہ

"لدود" کا واقعہ یہ ہے کہ جب ازواج مطہرات نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت سے بار بار غشی طاری ہو جاتی ہے اور آپ اس غشی میں اپنی کوکھ پکڑ لیتے ہیں، تو انہیں یہ شبہ ہوا کہ شاید سرکار دوجہاںؐ کو ذات الجنب کی شکایت ہے، اس لئے اگر لدود کیا جائے گا تو یہ آپ کے لئے مفید ثابت ہوگا، لدود کہتے ہیں ان دواؤں کو جو مریض کے منہ میں ایک طرف سے ڈالی جاتی ہیں جیسے وجور اس دوا کو کہتے ہیں جو حلق میں ٹپکائی جاتی ہے،

لدود کا مشورہ دینے والیں حضرت ام سلمہؓ اور حضرت اسماء بنت عمیسؓ تھیں کیونکہ انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا کہ اہل حبشہ ذات الجنب کی بیماری میں قسط (عود ہندی) کو زیت میں حل کر کے لدود کرتے ہیں۔

جب انہوں نے اس تجربہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دوا دینی چاہی تو آپ نے اس سے منع کیا۔ گھر والے سمجھے کہ آپ کا منع کرنا اسی نوعیت کا ہے، جس طرح عموماً مریض دوا سے نفرت کرتے ہیں، اور دوا پینے سے انکار کرتے ہیں۔ اس وجہ سے باوجود حضورؐ کے منع کرنے کے ازواج مطہرات نے دوا دیدی، جب آپ کو بیہوشی سے افاقہ ہوا تو فرمایا ——— کیا میں نے تم کو لدود سے منع نہ کیا تھا؟ ——— گھر والوں نے وہی جواب دیا جو وہ سمجھے تھے کہ حضورؐ دوا سے طبعاً نفرت فرما رہے ہیں جس کی وجہ سے ممانعت کی جا رہی ہے ——— فرمایا ——— تمام گھر والوں کو سوائے حضرت عباس رضؓ کے اسی طرح دوا دی جائے جس طرح مجھے دی گئی ہے۔ کیونکہ حضرت عباسؓ تمہارے ساتھ نہ تھے۔ ——— پھر فرمایا ——— میں نے تو اس لئے منع کیا تھا کہ ذات الجنب شیطان کے اثر سے ہوتا ہے، اور خدا تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو شیطانی تسلط سے محفوظ رکھتا ہے، پھر بھلا مجھے ذات الجنب کی شکایت کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن تم عورتوں نے اپنی

غلط تشخیص کی بنا پر میرے ساتھ ایسا کیا ،

مواہب لدنیہ کی روایت کے مطابق یہ واقعہ وفات سے ایک روز پہلے پیش آیا ۔

عطائی علاج کی مذمت

ہونے والی بات ہو چکی تھی ، مگر حضور ؐ نے گھر والوں سے لدود کا قصاص کیوں لیا ، ؟ ——— اور قصاص بھی اس قدر سختی کے ساتھ لیا کہ حضرت ام میمونہ رض روزے سے تھیں ان کے روزہ کا خیال بھی نہ رکھا گیا ، اور اُن کو بھی دوا پلائی ، جس کی انہیں بعد میں قضا رکھنی پڑی ۔

اس معاملہ پر اصحاب حدیث نے بڑی بحث کی ہے ، ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ، ——— عطائی علاج اور عطائی طبیبوں کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ———

" جو شخص بغیر طب جانے کسی کا علاج کرے وہ اس کا ضامن ہے "

چونکہ گھر والوں نے باوجود حضور ؐ کے منع کرنے کے آپ کو " لدود " کیا آپ منع کرتے رہے اور ایک نہ مانا ، اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لدود تجویز کرنے والوں اور ان کی اعانت کرنے والوں دونوں سے قصاص لیا ۔ اگر حضور ؐ منع نہ کرتے تو گھر والوں کی ذمہ داری پھر کم

ہوتی۔ لیکن جبکہ مریض، اپنے مرض کو سمجھتا ہو اور طبیب کی تشخیص کے مخالف ہو، اور طبیب ہو عطائی۔ اور پھر ——— عطائی حکیم اپنا اٹکل کا تیر چلائے تو ایسی صورت میں قصاص لینے کے سوا اور کونسا اقدام مناسب ہوسکتا تھا۔ تاکہ آیندہ اس قسم کے واقعات کی روک تھام ہوسکے۔

دعاء عافیت کبھی نہیں کی

علاج تو علاج روایتوں سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ نے اس مرض میں دعاء عافیت کی ——— بجائے دعاء عافیت کرنے کے نفس کو مخاطب کرکے یہ فرمایا ———

یا نفس مالک تلوذین کل ملاذ ——— اے نفس تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو ہر جگہ پناہ تلاش کرتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ اپنے نفس کو ملامت آمیز خطاب محض تواضع کی بنا پر تھا۔ ورنہ آپ نے نہ کبھی زندگی میں خدا کے سوا کسی سے پناہ چاہی اور نہ کسی قسم کی توقع رکھی۔

نبی کی خدمت فرض ہے

جس طرح نبی کے احکام کی اطاعت فرض ہے ——— اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ——— اسی طرح نبی کی موجودگی میں نبی کی ذاتی خدمت وعظمت بھی ضروری ہے، کیونکہ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے

لحاظ سے "احکام نبی" اور "ذاتِ نبی" دونوں کو خدا تعالیٰ نے موجب ہدایت قرار دیا ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ أَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (آلِ عمران)	تم کیونکر خدا تعالیٰ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پر خدا تعالیٰ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور نیز تم میں اس کا رسول موجود ہے۔

یعنی خدا کے احکام اور نبی کی شخصیت جو احکام الٰہی کا عملی مظہر ہے دونوں کی موجودگی میں تمہارا کفر کرنا بہت تعجب خیز ہے۔

سورۂ احزاب میں فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں لعنت اور پھٹکار کے مستحق بنتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب نبی کو اذیت پہنچانے والے ملعون قرار دیے گئے ہیں تو نبی کو آرام و راحت پہنچانے والے خدا کی رحمت اور پیار کے مستحق ہوں گے۔

صحابہ کی خدمتِ رسول پر ابوسفیان کی شہادت

"تاریخ گواہ ہے کہ اس فرض کے پیشِ نظر حضرات صحابہ کرام نے دل و جان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی وہ خدمت انجام دی کہ اس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔

ابوسفیان صلح حدیبیہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ تشریف لائے۔ یہ ابھی کافر تھے۔ انہوں نے حضرات صحابہ کرام کی خدمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی سچی محبت کا جو منظر دیکھا اسے وہ اپنی قوم میں واپس جاکر ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

"اے قریش! میں نے قیصر و کسریٰ کے بڑے بڑے دربار دیکھے ہیں۔ اور ان کی جاہ و حشمت کے بڑے بڑے مظاہرے میری آنکھوں میں ہیں۔ لیکن خدا کی قسم جو نقشہ میں نے محمدؐ اور اس کے ساتھیوں کا دیکھا وہ کہیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

محمدؐ کے ساتھی تو محمدؐ کا تھوک تک زمین پر گرنے نہیں دیتے۔ جب محمدؐ وضو کرتے ہیں تو گرنے والے پانی کو اس کے ساتھی ہاتھوں میں اٹھانے کے لئے دوڑتے ہیں۔ بھلا ہم ایسی اطاعت شعار اور خدمت گزار جماعت کی موجودگی میں محمدؐ کو شکست دے سکتے ہیں؟" (ابن ہشام)

حضورؐ کے بعض مخصوص خدّام

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام رسول اکرم صلعم کی خدمت کو اپنا سب سے بڑا شرف خیال کرتے تھے، اس لئے متعدد بزرگوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔

حضرت بلال رضؓ نے ابتدائے نبوت ہی سے آپ کی خانہ داری کا تمام کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اور رات دن اسی کام میں لگے رہتے تھے

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو یہ شرف حاصل تھا کہ جب آپ کہیں جاتے تو وہ پہلے آپ کو جوتیاں پہناتے۔ پھر آگے آگے عصا لے کر چلتے، آپ مجلس میں بیٹھنا چاہتے تو آپ کے پیروں سے جوتیاں نکالتے، پھر آپ کو عصا دیتے، آپ اٹھتے تو پھر اسی طرح جوتیاں پہناتے، آگے آگے عصا لے کر چلتے اور حجرہ مبارک تک پہنچاتے، آپ نہاتے تو پردہ کرتے، آپ سوتے تو بیدار کرتے، آپ سفر میں جاتے تو آپ کا بچھونا اٹھاتے۔ مسواک۔ جوتا۔ وضو کا پانی ساتھ رکھتے، اسی لئے انہیں "صاحب سواد" رسول اللہ کہا جاتا تھا یعنی آپ کے میر سامان۔ (اسوۂ صحابہ)

حضرت ربیعہ اسلمی رضؓ بھی شب و روز آپ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ جب آپ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کاشانۂ نبوت میں تشریف لے جاتے تو دروازہ پر بیٹھ جاتے، کہ مبادا کوئی ضرورت پیش آجائے، ایک روز حضورؐ نے ان سے کہا —— ربیعہ! تم شادی کر لو۔ ربیعہ رضؓ نے عرض کیا۔ حضورؐ آپ کی خدمت میں فرق آجائے گا۔ جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن جب آپ

نے بہت مجبور کیا تب انہوں نے نکاح کیا۔ (احمد)

ابوبکرؓ کا تیمارداری کی اجازت چاہنا

اخلاقی حیثیت سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ صحابہ کرام کا یہ فرض تھا کہ وہ اس ذاتِ گرامی کی خدمت اور محبت میں اپنی جان و مال وقف کر دیتے جس نے صحابہ کو "انسان" بنانے میں قابلِ رحم حد تک رات دن اپنی جان کھپائی ــــــ خدمت سے عظمت ہے، بے شک حضرات صحابہ نے اپنے محسنِ اعظم کی خدمت کا وہ حق ادا کیا کہ "عرب کے یہ چرواہے" عظمت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے، اور خدمتِ نبی کی بدولت دین و دنیا کی کامرانی حاصل کی۔

صحابہ کرام میں ہر اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ کو اولیت حاصل رہی ہے، جس طرح احکامِ نبی کی اطاعت میں ابوبکرؓ کا جواب پیش کرنا مشکل ہے، اسی طرح "خدمتِ رسول" میں بھی ان کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔

جب حضورؐ کی حالت بہت زیادہ خراب ہوئی تو یہ حالت دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تیمارداری کے سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کرنی چاہیں ــــــ لیکن حضورؐ نے ابوبکرؓ کی خدمات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ابوبکرؓ کی خدمات قبول کرنے سے کیوں انکار کیا ؟

یہ سوال اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے کہ ابوبکرؓ جیسے سچے خادم کی خدمات قبول کرنے سے کیوں انکار کیا۔ جبکہ ابوبکر نے اپنی تمام زندگی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقف کردی تھی ——— کیا آخری وقت میں ایسے مخلص خادم کو ایسی سعادت سے محروم کرنا اس کی جان نثاری کا صلہ تھا ؟

ہوسکتا ہے کہ اس موقعہ پر کوئی ، دشمن صحابہ، اپنی کج فہمی کا ثبوت دے۔ لیکن ہمیں کسی قسم کی بدگمانی کرنے سے پہلے نبی کریم صلعم کے ان الفاظ پر غور کرلینا چاہئے جو آپ نے ابوبکرؓ کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے، ——— آپ نے فرمایا: ———

ابوبکرؓ! اگر میں اپنی اس بیماری میں اپنی بیٹیوں۔ بیویوں اور اہل بیت سے خدمت نہ لوں گا۔ تو ان پر مصیبت نازل ہوجائے گی، اور تمہارا ثواب تو خدا کے ہاں لکھا گیا۔ جب تم نے اپنی طرف سے میری تیمارداری کے لئے اپنی خدمات پیش کردیں۔ (ماثبت بالسنۃ)

حضورؐ کا جواب اپنی جگہ بالکل صاف ہے، ظاہر ہے کہ جس قدر جس سے تعلق ہوتا ہے، اسی قدر اس پر خدمت کی ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلعم کو اہل بیت کرام اور ازواج مطہرات

سے نسبی تعلق کے ساتھ ساتھ جس قدر دلی محبت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس تعلق کا تقاضا تھا کہ یہ حضرات اس آخری بیماری میں پوری تندہی کے ساتھ حضورؐ کی خدمت بجا لائیں۔

اسی بنا پر سرکار دو جہاں نے دوسرے صحابہ کی خدمت قبول نہ فرمائی تاکہ تیمار داری کا تمام تر موقعہ اہل بیت کرام ہی کو حاصل رہے اور اس طرح یہ لوگ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کرتے تو نہ جانے خدا کی کس قدر ناراضگی ان کے حصہ میں آتی ———

اہل بیت رسولؐ کی ذمہ داری

اس موقعہ پر یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیئے کہ جن لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ السلام کے ساتھ خاندانی تعلق کا شرف حاصل ہے، ان پر اطاعت و محبت کی ذمہ داری سب سے سوا ہے۔

اس اعتبار سے کہ اگر ایک شخص اپنے آپ کو نواسہ رسول کہہ کر رسولؐ کی زندگی سے بغاوت کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ شخص خدا کا نافرمان ہے بلکہ وہ رسول اللہ صلعم کی خاندانی عظمت کی توہین کا بھی مرتکب ہے، ——— گو باپ اپنے بیٹے کے گناہوں کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا لیکن جب ایک بہادر باپ کا بیٹا ذلت اور بزدلی کی

موت مرتا ہے تو دیکھنے والے اس بات پر افسوس ضرور کرتے ہیں کہ اے کاش یہ فلاں باپ کا بیٹا نہ ہوتا۔ اسی لئے ایک بے عمل بیٹے کو جب نوح علیہ السلام اپنا بیٹا کہہ کر پکارتے ہیں۔ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ تنبیہ ہوتی ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (هود)

اے نوحؑ! یہ لڑکا تیری اہل میں سے نہیں۔ یہ تو مجسم عملِ بد ہے۔ سو تو ایسی بات کا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں رہیں تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے نہ ہو جائے۔

قرطاس کا مشہور واقعہ

ایام مرض کے دوران میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ ان میں قرطاس کا واقعہ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔

وفات سے تین روز قبل رسولِ اکرم علیہ التحیۃ والتسلیمات نے صحابہ کرام سے فرمایا۔ دوات قلم لاؤ، میں تمہیں ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوسکو، اس مجمع میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، انہوں نے فرمایا۔ حضورؐ کو اس وقت تکلیف زیادہ ہے اور تمہارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے، جو کافی ہے،

بعض صحابہ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا یہاں تک کہ باہمی بحث سے ان حضرات کی آواز بلند ہوگئی۔ اس سے حضورؐ کو تکلیف ہوئی اور صحابہ کرام کو اپنے پاس سے اٹھا دیا"

روافض کی فتنہ انگیزی

یہ واقعہ چونکہ حضرت عمر فاروق رضؓ کی طرف منسوب ہے اور واقعہ کے سطحی پہلو کو سامنے رکھ کر اس پر بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش بھی نکالی جا سکتی ہے۔ اس لئے روافض نے اس واقعہ میں جی کھول کر حضرت عمرؓ پر اعتراضات کئے ہیں۔

(۱) یہ کہتے ہیں کہ عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی میں گستاخی کی کہ نہ خود تعمیل ارشاد کی اور نہ دوسروں کو کرنے دی۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتمانِ حق پر مجبور کیا کہ حضورؐ علیؓ کے بارے میں خلافت کی وصیت کرنی چاہتے تھے۔ مگر نہ کر سکے۔

(۳) سرکارِ دوعالم کی طرف "ہذیان" کی نسبت کی۔

جہاں تک ان الزامات کا تعلق ہے۔ ہمیں ان پر ایک غیر جانب دار "مسلمان" کی حیثیت سے غور کرنا چاہئے۔

(۱) جس ذات نے اہم سے اہم موقعہ پر بھی جان و مال کی قربانی سے گریز نہ کیا اور رسول اللہ صلعم کے ارشاد کی تعمیل کی اس کا صرف

دوات قلم کے واقعہ میں سرکار دو عالم کی نافرمانی کرنا قرین قیاس نہیں حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے محض خلوص محبت کی وجہ سے آپ کو لکھوانے کی زحمت دینی گوارا نہ کی، کیونکہ اس وقت آپ پر بار بار دورے پڑ رہے تھے۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ حضور اگر کوئی امر ضروری لکھوانا چاہتے ہوں گے تو آپ افاقہ کے بعد لکھوا دیں گے، اور اگر امر ضروری نہیں تو پھر آپ سکوت اختیار فرمائیں گے، ہمارے لئے کتاب الٰہی کافی ہے۔

(۲) اگر حضرت علی رضؓ کی خلافت کے متعلق وصیت تحریر میں لانی مقصود ہوتی تو اس واقعہ کے بعد تین یا چار روز تک حضورؐ زندہ رہے، آپ نے کیوں نہ حکم دیا کہ یہ وصیت تحریر میں لے آؤ یا زبانی یاد رکھو، اور پھر اہل بیت کرام تو ہر وقت پاس موجود رہتے تھے اگر حضرت عمرؓ کا معاذ اللہ حضورؐ پر ایسا ہی دباؤ تھا تو ان کی عدم موجودگی میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو بلا کر یہ وصیت لکھوا دیتے۔

یہ بات بھی نہیں کہ اس کے بعد آپ کو اتنا ہوش ہی نہ رہا ہو کہ آپ کوئی وصیت کر سکیں۔ تین روز کے اندر سرکار نے متعدد وصیتیں فرمائیں۔ مگر خلافت علی رضؓ کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی معاملہ کو واضح کر دیتی ہے کہ

اگر حضرت علی رضؓ اور حضرت عباس یہ سمجھتے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے متعلق وصیت کرنا چاہتے تھے اور اس لئے دوات قلم منگائی تھی جسے عمر رضؓ نے ہمارے ساتھ دشمنی کی وجہ سے نہ لانے دیا تو انہیں چاہیئے تھا کہ وہ خود دوات قلم لے کر حضورؐ کے سامنے پیش کر دیتے اور درخواست کرتے کہ وصیت نامہ خلافت لکھوا دیجئے، کیونکہ جن حضرات نے سقیفہ بنی ساعدۃ کے اجتماع کے مقابلہ میں حضرت فاطمہ رضؓ کے گھر میں ہاشمیوں کا ایک الگ اجتماع منعقد کیا وہ خود اپنے لئے وصیت نامہ تحریر کرانے کی درخواست بھی کر سکتے تھے اگر انہیں اس بات کی توقع ہوتی کہ حضورؐ ہمارے لئے وصیت کرنے پر تیار ہیں۔

اس بات پر ہزار بار توبہ کرنی چاہیئے کہ کوئی شخص خدا کے رسول کو "کتمانِ حق" پر مجبور کر سکتا ہے، جسے زمین کی تمام مخالف قومیں بھی، اعلانِ حق سے نہ روک سکیں وہ عمر رضؓ سے رک جاتا ——؟ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

یہ عقیدہ خدا تعالیٰ کی اس آیت کی تکذیب ہے۔

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ،

اے نبی! جو احکام ہم آپ پر اتاریں انہیں آپ دوسروں تک پہنچایئے، اگر آپ نے اس میں کوتاہی کی تو آپ فرضِ رسالت ادا نہ کر سکیں گے

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔

رہی یہ بات کہ لوگ آپ کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کریں گے تاکہ آپ حق نہ پہنچا سکیں یا آپکو جسمانی اذیت پہنچائینگے) تو اس کے متعلق حق تعالیٰ آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کو محفوظ رکھے گا۔ بے شک خدا تعالیٰ نافرمانوں کو راہ نہیں سوجھاتا۔

یعنی منکرین حق اتنی قدرت پا ہی نہیں سکتے کہ وہ آپ کو حق پہنچانے سے روک سکیں۔

(۳) یہ کہنا کہ حضرت عمر رض نے حضور ؐ کی طرف "ہذیان" کی نسبت کی تاریخ سے اپنی ناواقفیت اور جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے مستند روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو صحابہ حضرت عمر رض کی رائے کے خلاف تھے انہوں نے کہا ـــــــ عمر رض! کیا حضور ؐ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں جو حضور ؐ کے ارشاد کی تعمیل سے اعراض کر رہے ہو ـــــــ؟ اور کہہ رہے ہو کہ تحقیق کر لو ۔ اھجر استفھموہ الفاظ پر غور کرنے والا ادنیٰ تامل سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ کلام حضرت عمر رض کے مخالف رائے رکھنے والوں کا تھا۔ نیز یہ کہ یہ کلام استعجاب و انکار کے طور پر تھا نہ اعتراف و اقرار کے طور پر

قرطاس کی روایت اہل تحقیق کی نظر میں

قرطاس والی روایت کو مورخین کے علاوہ محدثین میں اگرچہ بخاری اور مسلم نے بھی روایت کیا ہے لیکن اہل تحقیق جب ان امور کا لحاظ کرتے ہیں کہ ــــــــ

(۱) اس عظیم الشان واقعہ کو حضرت ابن عباس رضؓ کے سوا کسی دوسرے صحابی نے روایت نہیں کیا، ــــــــ (۲) وفات رسول کے وقت ابن عباس کی عمر کل ۱۳ یا ۱۴ برس کی تھی ــــــــ

(۳) یہ خود اس واقعہ کے وقت موجود نہ تھے، ــــــــ (۴) یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ انہوں نے یہ واقعہ کس سے سنا، تو ان تنقیحات کے پیش نظر جو محض قیاسی اور تخمینی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی ہیں۔

اہل تحقیق اس روایت کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس روایت سے اس بات پر استدلال کیا جاسکے کہ حضرت عمر رضؓ نے رسول اللہ کی نافرمانی کی، اور دوسرے صحابہ نے شان رسولؐ میں گستاخی کا ارتکاب کیا، یقیناً روایت کے بعض اہم پہلو راوی سے رہ گئے ہیں جن کی وجہ سے صحابۂ کرام میں یہ خیالات پیدا ہوئے۔ ورنہ محض قلم دوات مانگنے سے حضرات صحابہ رضؓ میں اس قسم کے خیالات پیدا نہیں ہوسکتے تھے۔ (ماخوذ الفاروق لعلامہ شبلی)

حضرت ابوبکر رض کی امامت کا اعلان

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے لئے کسی صحابی کے متعلق وصیت نہیں فرمائی، ہاں۔ اشارات کے درجہ میں بار بار آپ نے اپنی رائے کا اظہار ضرور کیا۔

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں ـــــــ "ایک روز اپنے معمول کے مطابق حضرت بلال رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دینے آئے، آپ نے ارشاد فرمایا ـــــــ "بلال رض سے کہہ دو کہ ابوبکر رض کو میری جانب سے حکم دیں کہ وہ نماز پڑھائیں۔ یہ حکم آپ نے اس لئے دیا تھا کہ آپ میں اب کمزوری کی وجہ سے مسجد میں جانے کی طاقت نہیں تھی۔ (صحیحین) ـــــــ

یہ واقعہ بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب والی عشاء کے وقت کا ہے۔

بلال رض کا صدمہ

یہ آواز بلال کے قلب حزین پر بجلی بن کر گری بلال رض نے سر پکڑ لیا اور کہا، ـــــــ

"ہائے میری امید کا منقطع ہو جانا، میری تو کمر ٹوٹ گئی، کاش میری ماں نے مجھے جنا نہ ہوتا، جو مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا"

جب حضرت عائشہ رض نے حضور ص کا حکم سنا تو عرض کیا ـــــــ

حضورؐ! میرے باپ رقیق القلب ہیں، جب وہ مصلےٰ آپ سے خالی دیکھیں گے تو انہیں اپنے اوپر قابو نہ رہے گا ——————

عائشہؓ فرماتی ہیں —————— "میرے دل میں ایک خیال یہ بھی پیدا ہوا کہ صحابہؓ ابوبکرؓ کو منحوس کہیں گے۔ کہ کیا ابوبکرؓ اس بات کے منتظر تھے کہ سرکارِ دوجہاں بیمار پڑیں اور میں نماز پڑھاؤں۔ اس وجہ سے میں نے عرض کیا —————— "تو حضورؐ بجائے ابوبکرؓ کے عمرؓ کو حکم دیجئے۔ کہ وہ نماز پڑھادیں" —————— اس کے ساتھ ساتھ میں نے حضرت حفصہؓ سے کہا کہ تم بھی میری تائید کرو" ——————

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی بات سنکر فرمایا۔ نہیں، ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہؓ نے تین مرتبہ وہی بات کہی۔ آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا۔ نہیں ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ اور تیسری بار یہ بھی کہا —————— انکن صواحب یوسف ——— تم سب یوسف والیاں ہو۔ یعنی جس طرح خواتین مصر نے حضرت یوسفؑ کو حق سے ڈگمگانا چاہا تھا۔ اسی طرح تم نے میرے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا۔ مگر حق تعالیٰ نے یوسفؑ کی طرح مجھے محفوظ رکھا۔

ابوبکرؓ کی بے ہوشی | حکم کے مطابق بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام

پہنچادیا۔ ارشاد نبوی کی تعمیل ضروری تھی، ابوبکرؓ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے۔

صاحبزادی نے اپنے باپ کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہی ہوا۔ ابوبکرؓ اپنے محبوب سے مسجد کو خالی پاکر اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ (لم یتمالك ان خر مغشیاً) اور غش کھا کر زمین پر گر پڑے ابوبکرؓ کا گرنا تھا کہ مسلمانوں کی ایک چیخ نکل پڑی۔ اور سب زار وقطار رونے لگے، حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا" یہ آواز کیسی ہے" وہ بولیں، حضورؐ! یہ مسلمانوں کے رونے کی آواز ہے۔

آپ بے چین ہو گئے، اور عباسؓ وعلیؓ کے کندھوں پر ٹیک لگا کر مسجد میں تشریف لائے۔ اور اپنا وہ آخری خطبہ دیا۔ جو وفات سے پانچ روز پہلے آپ کے آخری خطبہ کے نام سے مشہور ہے۔

امامت ابوبکرؓ فضیلت ابوبکرؓ پر کیوں دلیل ہے؟

کیا خدا کا رسول امت کے کسی بدترین فرد کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے؟

معاذاللہ، یہ ممکن نہیں، جو لوگ ابوبکرؓ کی فضیلت اور بزرگی پر شبہ کرتے ہیں، وہ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت پر غور کریں ابن عباسؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں ۔۔۔۔

ما قبض نبی حتی یصلی خلف صالح من امتی

کسی نبی نے وفات نہ پائی جب تک اپنی امت میں سے کسی صالح فرد کے پیچھے نماز نہ پڑھلی۔

ابن عباس رضؓ کہتے ہیں، حضورؐ نے ابوبکر رضؓ کے سوا کسی کے پیچھے نماز نہ پڑھی، ہاں ایک سفر میں حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے پیچھے صرف ایک رکعت ادا کی تھی اور اسی موقعہ پر اوپر والا جملہ فرمایا تھا۔ (کذا فی الصفوۃ)

امامت ابوبکر رضؓ پر تاکید در تاکید

ماثبت بالسنۃ میں حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے عبداللہ ابن زمعہ کی ایک روایت ذکر کی ہے، عبداللہ کہتے ہیں۔

مجھے حضورؐ نے حکم دیا، لوگوں سے کہدو، کہ خود نماز پڑھ لو، میں مسجد میں آیا تو مجھے حضرت عمر رضؓ ملے، میں نے ان سے کہا کہ آپ نماز پڑھا دیجئے۔ حضرت عمر رضؓ کی آواز بلند تھی، جب حضورؐ نے ان کی آواز سنی تو فرمایا۔ کیا یہ عمر رضؓ کی آواز ہے؟ عرض کیا گیا، جی ہاں، فرمایا: خدا تعالیٰ اور مسلمان اس سے انکار کرتے ہیں۔ تین دفعہ یہی جملہ فرمایا۔ پھر فرمایا ابوبکر رضؓ کو چاہیئے تھا کہ نماز پڑھاتے — حضرت عمر رضؓ نے جب یہ سنا تو عبداللہ ابن زمعہ پر بہت ناراض ہوئے کہ تو نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے خلاف مجھے نماز پڑھانے کے لئے کیوں کہا۔

کیا ابوبکرؓ کی امامت منسوخ کردی گئی تھی؟ شیعوں کا ایک مضحکہ خیز اعتراض

امامت ابوبکرؓ کا اعلان اس بات کا صاف اظہار تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو بہتر سمجھتے تھے اس لئے شیعوں نے امامت ابوبکرؓ پر ایک مضحکہ خیز اعتراض کیا ہے، یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلعم نے اسی روز جمعرات کو ظہر کے وقت مسجد میں تشریف لاکر خود امامت فرمائی، جس کے معنی یہ تھے کہ آپ نے ابوبکرؓ کو امامت سے معزول کرنے کا اعلان کردیا تھا۔

یہ اندھے تعصب کی ایک بدترین مثال ہے، تاریخ بتا رہی ہے کہ جب آپ ظہر کے وقت مسجد میں تشریف لائے، تو ابوبکرؓ نے مصلے سے پیچھے ہٹنا چاہا، آپ نے فرمایا۔

صَلِّ بِالنَّاس — لوگوں کو نماز پڑھائے جا

یہ کہہ کر آپ ابوبکرؓ کی بائیں طرف بیٹھ گئے، تو اس صورت میں ابوبکرؓ امامت سے علیحدہ نہیں ہوئے تھے: بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کے امام تھے اور ابوبکر تمام صحابہ کے امام تھے۔

پس کیسی جلی النصافی ہے کہ ابوبکر جمعرات کی عشاء سے لے کر پیر کی صبح تک رسول اللہ کی حیات میں (ظہر کو چھوڑ کر) مسلسل ۲۱

نمازیں پڑھائیں اور دربارِ رسالت سے کوئی اعلان جاری نہ ہو کہ ابوبکر رضؓ کی جگہ علی رضؓ یا عباس رضؓ کو امام بنا دیا جائے اور پھر بھی ابوبکر کو خلافت کا غاصب کہا جائے۔

امامت ابوبکر رضؓ کے متعلق حضرت علی رضؓ کا قول

جن بزرگ کی عقیدت میں غصب خلافت کا یہ تمام طوفان برپا ہے ذرا خود انہی بزرگ سے پوچھیے کہ وہ امامت ابوبکر رضؓ کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حافظ ابن عساکر نے حضرت علی رضؓ کا ایک قول نقل کیا ہے، حضرت علی رضؓ فرماتے ہیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ حالانکہ ہم موجود تھے۔ غائب نہ تھے، تندرست تھے، بیمار نہ تھے، اگر آپ مجھے امام بناتے تو بنا سکتے تھے، لیکن جب حضورؐ نے ابوبکر رضؓ کو نماز جیسی اہم عبادت میں ہمارا امام بنانا پسند کیا تو ہم نے دنیا کے معاملہ میں ان کا امام ہونا پسند کر لیا۔

حضرت علی رضؓ کو خود بھی یقین نہ تھا کہ حضورؐ میرے متعلق وصیت فرمائیں گے

اگر خلافت کے مسئلہ میں "فداکارانِ اہل بیت" حضرت علی رضؓ کے فیصلہ ہی پر اعتماد کر لیں تو امت مسلمہ میں ایک بہت بڑے فتنہ کا انسداد ہو جائے لیکن

وہاں تو " مدعی سست اور گواہ چست " کی مثال صادق آرہی ہے"

بیماری کے ایام میں ایک روز حضرت علی رضؓ اور حضرت عباس رضؓ حجرۂ عائشہ سے باہر تشریف لائے ، ایک صاحب نے حضرت علی رضؓ سے پوچھا، ابوالحسن ! حضورؐ کی طبیعت کیسی ہے ؟

حضرت علی رضؓ نے فرمایا ۔ اچھی ہے ۔ حضرت عباس رضؓ نے یہ سنکر فرمایا ۔ علی رضؓ ! یہ تم نے کیا کہا ۔ دیکھو ! تم تین روز کے بعد بے اقتدار ہو جاؤ گے ، میں عبدالمطلب کی اولاد کے بشرے کی اس کیفیت کو جو موت کے وقت ان پر طاری ہوتی ہے ۔ اچھی طرح پہچانتا ہوں ، اس بنا پر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حضورؐ اس بیماری سے نجات نہیں پائیں گے ۔ لہذا تم میرے ساتھ چلو ۔ اگر خلافت ہمارا حق ہے ، تو ہم اسے معلوم کرلیں ، اور اگر ایسا نہ ہو تو ہم اپنے حق میں اچھی وصیت کرالیں ۔

حضرت علی رضؓ نے فرمایا ، اے عباس ! اگر ہم نے حضورؐ سے کہا اور آپ نے انکار کر دیا ، تو کیا اس کے بعد مسلمان ہمیں خلافت سونپ دیں گے ــــــ؟ــــــ "

حضرت علی رضؓ کا یہ انتہائی تدبر تھا کہ حضورؐ سے خلافت کے متعلق کچھ نہ پوچھا ، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ حضورؐ انکار کردیں گے جس کے بعد خلافت کا امکان ہی باقی نہ رہے گا ۔ اور اب کم از کم ممکن تو ہے کہ مسلمان خلافت

کے لئے میرا انتخاب کرلیں۔

مسجد کی طرف کی کھڑکیاں بند کرنے کا حکم

وفات سے پانچ روز پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں جو اپنا آخری خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا

"مسجد کی طرف جن جن مکانات کی کھڑکیاں ہیں انہیں بند کر دیا جائے سوائے ابوبکر رضؓ کی کھڑکی کے" ——— ابوبکر رضؓ کے مکان کی کھڑکی کو اس حکم سے مستثنیٰ کرنے میں یہ اشارہ تھا کہ ابوبکرؓ رسول اللہؐ کے بعد جانشین رسولؐ ہونے والے ہیں۔ انہیں مسجد رسولؐ میں جو مسلمانوں کی شوریٰ گاہ اور دارالامارۃ ہے۔ بار بار آنے کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے آنے جانے کی سہولت کے لئے ان کا دروازہ کھلا رہنا ضروری ہے،

طبرانی کی ایک روایت میں اتنا اور زیادہ ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے عرض کیا حضورؐ! ہمارے دروازے کیوں بند کرا دیئے گئے؟ تو آپ نے فرمایا، میں نے خود بند نہیں کئے بلکہ خدا تعالیٰ نے مجھے بند کرنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت علی رضؓ کی تین خصوصیتیں

اس موقعہ پر بھی شیعہ اور اہل سنت میں ایک نزاعی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ امام احمدؒ نے حضرت ابن عمر رضؓ سے ایک روایت نقل

کی ہے۔ ابن عمر رضؓ کہتے ہیں، صحابۂ کرام میں حضرت علی رضؓ کو تین خصوصیتیں حاصل ہیں، (۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی کو علی رضؓ کے نکاح میں دیا۔ جس سے علی رضؓ کی اولاد بھی ہوئی۔ (۲) غزوہ خیبر میں حضرت علی رضؓ کو عَلَم عنایت فرمایا۔ حالانکہ اس وقت بڑے بڑے صحابہ رضؓ اس کے خواہش مند تھے۔ (۳) مسجد کی جانب جس قدر دروازے تھے وہ سب کے سب آخر وقت میں بند کرا دیئے، سوائے حضرت علی رضؓ کے دروازے کے،

اس روایت کی بنا پر شیعوں کی رائے یہ ہے کہ یہ خصوصیت حضرت علی رضؓ کی ہے، حضرت ابوبکر رضؓ سے اس کا کوئی تعلق نہیں جس روایت میں ابوبکر رضؓ کا ذکر آتا ہے وہ روایت ہی غلط ہے۔

دونوں روایتوں میں رفع تعارض کی کیا صورت ہے؟

بظاہر یہ ایک کھلا تعارض ہے جس کی وجہ سے علامہ ابن جوزی نے ابن عمر رضؓ کی روایت کو موضوع قرار دیدیا ہے، اور ان کے نزدیک یہ روایت شیعوں نے وضع کی ہے تاکہ ابوبکر رضؓ کی اس فضیلت کو اس روایت کے ذریعہ رد کردیں — لیکن علامہ ابن حجر عسقلانی جیسے محقق کو ابن جوزی کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔

ابن حجر عسقلانی نے کیونکر تطبیق دی

علامہ ابن حجر کے نزدیک ابن عمر رضؓ کی یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف نہیں ہے، اس لئے ایک روایت کو ساقط الاعتبار قرار دے کر تعارض دور کرنا درست نہیں، بلکہ رفع تعارض کا آسان اور معقول طریقہ یہ ہے، علامہ فرماتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کا حکم دو مرتبہ دیا تھا، ایک دفعہ فرمایا، ——" جن لوگوں کے دروازے مسجد کی طرف ہیں، انہیں بند کر دیا جائے، لوگوں کو چاہیئے کہ دوسری طرف دروازے بنالیں، کیونکہ مسجد میں سے آمدورفت رکھنا احترام مسجد کے خلاف ہے۔ صحابہ کرام نے حکم کی تعمیل کی اور دروازے بند کر دیئے مگر مسجد کی طرف چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنالیں تاکہ صرف نماز کے لئے آجا سکیں۔

لیکن چونکہ حضرت علی رضؓ دوسری طرف دروازہ بنا ہی نہیں سکتے تھے، ان کے مکان کی صورت حال ایسی ہی تھی۔ اس لئے وہ اس حکم سے مستثنیٰ رہے اور بدستور اسی دروازے سے آمدورفت رکھی۔

ابن عمر رضؓ کی روایت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

دوسرا حکم جو رسول اللہ نے وفات سے پانچ روز قبل دیا اس

میں آپ نے ان کھڑکیوں کے بند کرنے کا بھی حکم دیدیا۔ جو صحابہ رضہ نے دروازے بند کراکر بنوالی تھیں۔ البتہ حضرت ابوبکر رضہ کی کھڑکی بحالہ باقی رکھی گئی۔

یہ توجیہ حقیقت حال کی صحیح تصویر ہے، قیاس و تخمین نہیں۔ اس سے ابوبکر رضہ کی خصوصیت نمایاں ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضہ کی کھڑکی بلا کسی مجبوری کے قصداً اور ضرورۃً کھلی رکھی گئی، حالانکہ ان کے مکان کا دروازہ دوسری طرف بھی موجود تھا۔

برخلاف حضرت علی رضہ کے دروازے کے، ان کے مکان کا دروازہ دوسری جانب موجود ہی نہ تھا۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ اس دروازے سے آمد و رفت رکھیں۔

ابوبکر رضہ کے ساتھ محبت کا اعلان

جب آپ نے حضرت ابوبکر رضہ کے ساتھ یہ ترجیحی سلوک برتا ہوگا تو ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں کسی قسم کا خیال گزرا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تخصیص پر روشنی ڈالنے کی غرض سے اسی خطبہ میں ابوبکر رضہ کے متعلق فرمایا —— "ابوبکر رضہ میرے غار کے ساتھی ہیں، اگر مجھے خدا کے سوا کسی دوسرے کو "خلیل" بنانے کی اجازت ہوتی تو میں ابوبکر رضہ کو اپنا خلیل بناتا، مگر "دینی اخوت" کافی ہے۔

حضرت فاطمہ رضؓ کا ہنسنا اور رونا

حضرت فاطمہ رضؓ کو بیماری کے ایام ہی میں اپنے پیارے باپ کی وفات کا علم ہو چکا تھا، کیونکہ آپ متعدد موقعوں پر اس بات کا اظہار فرما چکے تھے۔ جب باپ نے اپنی بیٹی کے متعلق یہ فرما کر اسے دنیا کی نگاہوں میں بے پناہ عزت و وقار کا مستحق بنایا ——

"فاطمہ رضؓ میرے کلیجہ کا ٹکڑا ہے۔ جو اسے تکلیف دیتا ہے وہ مجھے تکلیف دیتا ہے۔ جو اسے راحت پہنچاتا ہے وہ مجھے راحت پہنچاتا ہے" ——

اس باپ کی جدائی کے خیال نے فاطمہ رضؓ کو ناقابلِ بیان صدمہ پہنچایا۔ جب باپ نے بیٹی کے صدمہ کا احساس کیا تو انہیں ایک عظیم الشان خوشخبری سُنائی تاکہ بیٹی کا صدمہ کم ہو جائے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں —— "بیماری کے ایام میں ایک روز حضرت فاطمہ رضؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائیں فاطمہ رضؓ کی چال ڈھال حضورؐ سے بہت ملتی جلتی تھی، آپ نے فاطمہ رضؓ کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اور آہستہ سے کچھ فرمایا، فاطمہ رضؓ رونے لگیں، اس کے بعد آپ نے پھر کچھ فرمایا تو فاطمہ رضؓ ہنسنے لگیں" ——

میں نے فاطمہ رضؓ سے پوچھا، فاطمہ! یہ کیا راز داری ہوئی کہ پہلے رونے لگیں اور پھر ہنسنے لگیں، راز دار بیٹی نے باپ کا راز فاش کرنے سے

انکار کر دیا۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں۔ وصال کے بعد میں نے ایک روز پوچھا۔ فاطمہ رضؓ! اب تو بتادو کہ وہ کیا بات تھی۔ فاطمہ رضؓ نے جواب دیا اماں جان! پہلے حضور صلعم نے مجھے اپنی وفات کی روح فرسا خبر دی تو میں رونے لگی۔ پھر آپ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے ایک خوشخبری سنائی، اور فرمایا، فاطمہ رضؓ! کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ میرے اہل بیت میں تو سب سے پہلے مجھ سے ملاقات کرے، اور خدا تعالیٰ تجھے جنت کی عورتوں کا سردار بنائے، یہ سنکر میں ہنسنے لگی۔

حضورؐ کی پیشنگوئی پوری ہوئی

۲۹ سال کی عمر، کوئی مرنے کی عمر ہے، مگر باپ کی جدائی نے فاطمہ رضؓ کی کمر توڑ دی تھی، حضورؐ کی وفات کے بعد کل چھ مہینہ زندہ رہ سکیں، اور چھ ماہ مسلسل بیمار رہ کر اپنے پیارے باپ سے جا ملیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثال زہد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ آپ کی معاشرت غریبوں اور مسکینوں سے بلند نہ ہونے پائے، گو اسلام نے مال و دولت کو مطلقاً حرام قرار نہیں دیا ہے، لیکن آپ نے اپنے لئے غریبانہ

زندگی کو پسند فرمایا، اور تن آسانیوں سے کوسوں دور رہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ امت کے لاکھوں غریب اپنے پیغمبر کی سادہ زندگی دیکھ کر اپنی غریبی پہ بجائے ناشکری کرنے کے فخر و مسرت محسوس کریں، اور انہیں جب یہ معلوم ہو کہ سردارِ دو عالمؐ نے ——— الفقر فخری ——— فقر میرا فخر ہے ——— فرمایا ہے تو ان کی غریبی بھی ان کے لئے ناسپاسی اور رنج و ملال کا موجب نہ بنے۔

چراغ میں تیل بھی نہ تھا

حضرت عائشہ فرماتی ہیں "جس پیر کی صبح کو آپ کی وفات ہونے والی تھی، اسی کی رات کو آپ پر مرض کی شدت کے پے در پے حملے ہو رہے تھے، جس کی وجہ سے آپ نہایت مضطرب تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں روشنی تک نہ تھی، میں نے ایک زوجہ مطہرہ کے پاس گھر کا چراغ بھیجا تاکہ وہ تیل کی چند بوندیں ڈال دیں۔

دولت چھوڑنی پسند نہ کی

صرف یہی نہیں کہ آفتابِ رسالت کے گھر میں اندھیرا تھا، بلکہ سردارِ دو جہاں کو دولت سے اس قدر نفرت تھی کہ آپ نے اپنے بعد چند دینار بھی چھوڑنے پسند نہ کئے۔

حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں ——— حضورؐ نے میرے پاس

دس دینار رکھوائے تھے، وفات سے پہلے فرمانے لگے، عائشہ رضؓ وہ دینار کہاں ہیں۔؟ میں نے عرض کیا، حضورؐ میرے پاس ہیں۔ فرمایا خیرات کر دو، یہ کہہ کر آپ بے ہوش ہو گئے، اور میں آپ کی خدمت میں اس قدر مشغول ہو گئی کہ مجھے آپ کا حکم یاد نہ رہا، اس کے بعد جب آپ کو ہوش آیا تو فرمایا۔ کیا وہ دینار صدقہ کر دیئے ؟ میں نے معذرت کی کہ مجھے یاد نہیں رہا تھا، فرمایا۔ اچھا۔ لاؤ، میں گئی اور وہ دینار لے آئی، آپ نے ان دیناروں کو ہتھیلی پر رکھ کر فرمایا۔ محمدؐ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے رب سے اس حال میں ملے کہ اس کے گھر میں یہ سونا موجود ہو،

یہ فرما کر وہ دینار حضرت علی رضؓ کو دیدیئے اور حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر آؤ۔

کن کپڑوں میں وفات پائی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ زہد کچھ کم ہدایت آموز نہیں۔ اسی زہد کو حضرت عائشہ رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کی عبرت کے لئے پیش فرماتی تھیں، تاکہ مسلمانوں میں دنیا پرستی سے نفرت پیدا ہو جائے، کہ اگر عیش دنیا میں زیادہ انہماک کوئی مفید بات ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور اختیار

کرتے

چنانچہ حضرت عائشہ رضؓ کے بھانجے حضرت عروہؓ فرماتے ہیں۔
ایک روز ہم چند نوجوان حضرت عائشہ رضؓ کے پاس پہنچے اور حضورؐ کی معاشرت کے متعلق سوال کیا۔ آپ اندر گئیں اور ایک پیوند لگی موٹی چادر اور ایک تہبند نکال کر لائیں۔ اور فرمایا۔ سردارِ دوجہاں نے ان کپڑوں میں وفات پائی تھی ـــــــ یعنی یہ تھی آپ کی معاشرت!

سلف کی ناخلف اولاد

کیا یہ اسی پیغمبر کی امت ہے جو مال و دولت پر، اخلاق، شرافت تہذیب اور ایمان کو قربان کر رہی ہے، اور پھر کہتی ہے کہ ہم "غلامانِ محمدؐ ہیں اور اس لئے زمین کا اقتدار ہمیں ملنا چاہیئے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ (اعراف)

ان بڑوں کے بعد پھر ایسے ناخلف چھوٹے آئے جو کتاب کے وارث تو بنے مگر دنیا کا حقیر مال اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہماری خطائیں معاف ہو جائیں گی لیکن اگر وہی مالِ حرام پھر ان کے سامنے آتا ہے تو وہ پھر اسے لے لیتے ہیں۔

مسلمانوں کو یہ سبق نہ بھلانا چاہیئے کہ باعزت ترقی صرف

دولت سے حاصل نہیں ہوتی، جب تک کیرکٹر کی پابندی اور اخلاق کی پاکیزگی حاصل نہ ہو۔ اقبال نے کہا ہے ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں میرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں میری قوم کے جسور و غیور
قلندری میری کچھ کم سکندری سے نہیں

امت کو دیکھنے کا اشتیاق

ابوبکرؓ کے زیرِ قیادت مسلمانوں کی تنظیم پر اظہارِ مسرت

نبی کریم صلعم حجرات کی ظہر کے بعد سے امت کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ امت تو بے چین تھی، مگر امت کا عاشق بھی اپنی جگہ مضطرب تھا۔ جس پیر کے دن آپ وفات پانے والے تھے، اس پیر کی صبح کو ذرا ہوش آیا، مسجد میں صبح کی نماز ہو رہی تھی، پردہ اٹھا کر امت کو دیکھا، اور مسکرا دیئے ابوبکرؓ نے مصلے چھوڑ کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر اشارہ سے منع کر دیا۔

اور اگر پردہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے،

یہ مسکراہٹ کیسی تھی؟ ـــــــ یہ اس بات پر خوشی کا اظہار تھا کہ مسلمان ابوبکر رضؓ کی امامت میں منظم ہیں۔ اور اللہ کا پیغمبر اپنی امت کو ایسی قابلِ اطمینان حالت میں چھوڑ رہا ہے کہ اگر امت اسی تنظیم و اتحاد ـــــــ محض تنظیم و اتحاد نہیں بلکہ خدا پرستی اور قیامِ دین کے لئے تنظیم و اتحاد ـــــــ پر قائم رہی تو ترقی کے راستہ پر گامزن رہے گی۔

اسلام اور طہارت

یہ صرف دعوٰے ہی نہیں بلکہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جس طرح اسلام نے روحانیت و اخلاق، تمدن و معاشرت کے باب میں انسانیت کے لئے ایسے کامل احکام بیان کئے ہیں جن پر نہ اضافہ ممکن ہے نہ ترمیم، اسی طرح طہارت و صفائی کے متعلق اسلام نے جو ہدایات دی ہیں وہ بھی ایسی جامع ہیں کہ نظر انسانی جسم کی صفائی کا اس سے اعلیٰ معیار قائم نہیں کر سکتی۔

بس یوں سمجھئے کہ اسلام نام ہی جسم اور روح کی مکمل طہارت کے ایک جامع دستور کا ہے۔

حضرت عائشہ کا فخر!

آخری وقت میں مسواک سے محبت کا اظہار

اسلامی تعلیمات کے علاوہ حضور پیغمبر اسلام صلعم ذاتی طور پر بھی بہت زیادہ لطافت پسند تھے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے آپ کی ذات گرامی کو اسلامی طہارت و لطافت کا مکمل نمونہ بنایا تھا، چنانچہ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، یہ فخر صرف مجھ ہی کو حاصل ہے۔ اور یہ مجھ پر خدا تعالیٰ کا انعام ہے کہ حضورؐ نے میرے گھر میں وفات پائی، میری باری کے دن وفات پائی، اور خدا تعالیٰ نے موت کے وقت میرا اور آپ کا لعاب جمع کیا،

واقعہ یہ ہوا کہ ایک روز میرے بھائی حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی بکر مسواک کرتے ہوئے میرے گھر میں داخل ہوئے، اس وقت حضورؐ میری گود سے سہارا لگائے بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ میرے بھائی کی طرف دیکھ رہے ہیں، میں سمجھ گئی کہ حضورؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں، میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں آپ کے لئے مسواک لے لوں ؟ آپ نے سر کے اشارہ سے فرمایا، ہاں! میں نے بھائی سے مسواک لے کر حضورؐ کو دیدی۔ لیکن کمزوری کی وجہ سے

آپ اسے چبا نہ سکے، میں نے آپ سے لے کر اسے چبایا اور نرم کر کے آپ کو دیدی۔ آپ نے اسے اپنے منہ میں پھرایا۔

عزرائیل کی آمد!

جبریل علیہ السلام کی مزاج پرسی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے ایام میں آخری دو دن ایسے گزرے کہ ان میں روزانہ حضورؐ کے پاس جبریلؑ تشریف لاتے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے سرکار دوعالمؐ کی مزاج پرسی فرماتے، تیسرے دن یعنی پیر کو جب حضرت جبریلؑ آئے تو ان کے ساتھ حضرت عزرائیل بھی تھے، جبریلؑ نے حسب معمول خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ حضورؐ نے پوچھا یہ آج آپ کے ساتھ کون ہے، جبریلؑ بولے، عزرائیلؑ ہیں، اور حضورؐ! میرا بھی دنیا میں یہ آخری آنا ہے، اور جناب کا بھی یہ آخری وقت ہے آپ کے بعد نہ تو میں کسی کی موت پر آؤں گا اور نہ وحی لے کر زمین پر اتروں گا۔ (ماثبت)

عزرائیلؑ کی گزارش اس کے بعد حضرت عزرائیل نے سرکار دوعالمؐ سے گزارش کی، حضورؐ! خدا تعالیٰ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں

آپ کی اطاعت کروں، جو آپ فرمائیں اُسے بجا لاؤں، ارشاد ہو تو قبض روح کروں، ارشاد نہ ہو تو واپس چلا جاؤں۔

جبریلؑ نے عرض کیا، سرکارؐ! خدا تعالیٰ آپ کا مشتاق ہے، فرمایا، اچھا، اے عزرائیلؑ! جو کچھ تمہیں حکم ہوا ہے اسے کر گزرو، مجھے اپنے رب کی مرضی قبول ہے۔

وفاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہ گفتگو پیر کے روز زوال کے بعد ہو رہی تھی، آپ کے اجازت دیتے ہی "سکرۂ موت" محسوس ہونی شروع ہو گئی۔ آپ کے پاس پانی کا ایک پیالہ تھا، جس میں آپ بار بار ہاتھ ڈالتے تھے اور منہ پر ملتے تھے۔

آخری کلمات کبھی آپ کی زبان پر یہ جملے جاری ہوتے تھے

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی سَکَرَاتِ الْمَوْتِ۔ اے اللہ! موت کی بے ہوشی پر میری مدد فرما۔

اور کبھی یہ جملے

رب اغفر لی والحقنی بالرفیق الاعلیٰ۔ میرے رب میری مغفرت فرما۔ مجھے میرے سب سے بڑے دوست یعنی اپنی ذات سے ملا دے۔

اور کبھی رفیق اعلیٰ کی تفصیل کے ساتھ یہ جملے زبان پر جاری ہوتے تھے۔

مع الرفیق الاعلیٰ فی الجنۃ	جنت میں رفیق اعلیٰ کے ساتھ، ان کے ہمراہ
مع الذین انعم اللہ علیھم من	جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، یعنی
النبیین والصدیقین	انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور نیک
والشھداء والصالحین	لوگ اور وہ کیا اچھے رفیق ہیں۔

وحسن اولئک رفیقا۔

حضرت عائشہ رض کی روایت میں آتا ہے کہ آپ کی زبان پر یہ جملے جاری ہوئے۔

لا الٰہ الا اللہ انّ للموتِ سَکَرَات

اور پھر آپ نے ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا کی۔

اللّٰھُمَّ الرفیق الاعلیٰ

آپ یہ جملے ادا کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کے ہاتھ جھک گئے۔ اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

حضرت عائشہ رض نے آپ کا سر مبارک اپنے زانو سے ہٹا کر تکیہ پر رکھ دیا۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

زندگی میں حضور صلعم کی جدائی سے صحابہ رضی کی کیا حالت ہو جاتی تھی

صحابہ کرام رضی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے، جن کے لئے وہ چند لمحے قیامت کے لمحے ثابت ہوتے تھے۔ جن میں ان کا محبوب ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا، زندگی میں اگر کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو چند منٹ نظر نہیں آتے تھے، تو وہ دیوانہ وار تلاش محبوب میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی کا واقعہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں ——— ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا، بے چین ہو گیا ازواج مطہرات کے حجروں میں تلاش کیا۔ آپ کہیں نہ ملے، اور بے چینی بڑھ گئی، اب میں نے آپ کو تلاش کرنا شروع کیا، ہر جگہ دیکھا، اور ہر شخص سے پوچھا، دل کی لگن منزل پر پہنچا کر دم لیتی ہے۔ اتفاق سے میں ایک باغ پر جا پہنچا، (دل نے کہا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باغ کے اندر ہیں۔ ورنہ وہاں بتانے والا کون بیٹھا تھا) دل کی آواز پر باغ میں داخل ہونا چاہا مگر دروازہ بند پایا، دل کی بے تابی قرار نہیں لینے دے رہی تھی۔ ایک نالہ

دیکھا جو باغ کے اندر پہنچا ہوا تھا۔ اس نالہ کے اندر سے گھس کر باغ میں جا داخل ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ محبوب دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کنوئیں پہ پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ (بخاری)

ایک اعرابی کا واقعہ

ایک روز ایک اعرابی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا۔

یارسول اللہ! جب گھر میں آپ کا ذکر ہوتا ہے یا کہیں آپ کا نام سن پاتا ہوں تو مجبور ہو جاتا ہوں کہ آپ کے چہرۂ انور کی زیارت کروں (اسے تصنع نہ سمجھئے، بات یہ ہے کہ سچی محبت چھپتی نہیں، اپنا اظہار خود کرتی ہے) در دولت پہ حاضر ہوتا ہوں اور زیارت سے مشرف ہوکر چلا جاتا ہوں، بے قراری کم ہو جاتی ہے، لیکن ایک غم کھائے جا رہا ہے، یہ بتائیے کہ جنت میں یہ کیوں کر ممکن ہوگا کہ میں جب چاہوں آپ کی زیارت کرلوں، جبکہ آپ کا درجہ ہم سے بہت بلند ہوگا اتنا بلند جہاں ہماری رسائی ممکن نہیں، ——— سوال نہایت اہم تھا۔ بھلا خدا کی ہدایت کے بغیر کیا حل ہوتا۔ ——— حضور نے تامل کیا، فوراً جبریل تشریف لائے اور خدا تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچایا۔

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہیں گے، انہیں ان کی اطاعت کی نسبت سے محبوب دوعالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہوگی۔

اطاعت گزاروں کو اپنے محبوب کے فراق کا اندیشہ نہ کرنا چاہیئے۔

صحابیات کی حالت عورتوں کی حالت یہ تھی کہ جب حضورؐ کسی سفر یا غزوہ میں تشریف لے جاتے تو صحابیات فرطِ محبت سے آپ کی واپسی اور سلامتی کے لئے نذریں مانتی تھیں، اور جب تک حضورؐ واپس نہ آجاتے تھے مدینہ کا بچہ بچہ بے چین رہتا تھا۔

وفات رسولؐ کے بعد صحابہ کرام کی حالت

حضرت عمرؓ کا واقعہ جو حضرات چند منٹ کی جدائی برداشت نہ کر سکتے تھے، ان پر حضورؐ کی وفات سے کیا قیامت ٹوٹی ہوگی ؟ —— وہ ایک قیامت خیز منظر ہے، جسے الفاظ کے ذریعہ کیونکر بیان کیا جا سکتا ہے، لیکن جو کچھ بیان کیا جا سکتا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

حضرت عمرؓ صحابۂ کرام میں بڑے ہوش مند صحابی ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ہوش رُبا صدمہ نے سب

سے زیادہ انہیں متاثر کیا" عمرؓ حواس باختہ ہوگئے، ان کی ازخودرفتگی نے انہیں کہاں پہنچا دیا۔ ــــــ روایات میں آتا ہے،

عمرؓ تلوار سونت کر مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ اور علی الاعلان کہنا شروع کر دیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی ہے۔ میں اس گستاخ کا سر قلم کردوں گا۔ واللہ حضورؐ تو موسیٰ علیہ السلام کی طرح چالیس روز کے لئے اپنی قوم سے غائب ہوگئے ہیں۔ آپ تشریف لائیں گے اور اس وقت تک وفات نہ پائیں گے جب تک کہ ان منافقین کا پوری طرح استیصال نہ فرما دیں گے، ــــــ عکرمہؓ کہتے ہیں ــــــ

عمرؓ کے جوش غضب کا یہ عالم تھا کہ منہ میں کف بھرا ہوا تھا اور آواز کی گرج میں کسی طرح فرق نہیں آرہا تھا۔

عمرؓ کیوں ازخودرفتہ ہوئے؟

واقعہ یہ تھا کہ حضورؐ کی وفات کی خبر نے منافقین مدینہ میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی، اور یہ اس خیال سے بغلیں بجاتے پھر رہے تھے کہ اب ہماری سازشوں کے بارآور ہونے کا وقت آگیا کیونکہ نبی کریم ہی کی ذات گرامی تھی، جنہوں نے خدا کی وحی سے مطلع ہوکر ہمیشہ منافقین کی چالوں کو بروقت بے نقاب کیا، اور ناکام

ہو کر رہ گئے۔ بس منافقین کی خوشی کے لئے یہ بات کافی تھی کہ نہ اب نگہ نبوت کی وہ معصوم بصیرت ہے، جو ہماری چالوں کی گہرائی کو سمجھ سکے اور نہ جبریلؑ امین کا وہ پیغام ہے جو ہمارے مکروفریب کا پردہ چاک کر سکے۔

حضرت عمرؓ نے جب منافقین کی یہ چہ میگوئیاں سنیں تو آپ کو اس سے بھی سخت رنج ہوا اور اسے ایک عظیم خطرہ محسوس کر کے اس قدر خود رفتہ ہو گئے کہ دیوانہ وار یہ اعلان کرنا شروع کر دیا تاکہ منافقین کا یہ فتنہ بڑھنے سے رک جائے (ابن ابی شیبہ ابن عمرؓ)

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ منافقین کا یہ فتنہ یقیناً ایسا تھا، جس سے شیرازہ اسلامی بکھر جاتا مگر عمرؓ کی مسلح للکار سے منافقین کے دل دہل گئے اور مدینہ میں سناٹا چھا گیا، جس سے منافقین کی امنگیں مٹ گئیں، اور جن مسلمانوں کے متاثر ہونے کا امکان تھا وہ اس سے بچ گئے۔

ابوبکرؓ کی تشریف آوری

یہ عمرؓ کون ہیں؟ جن کے متعلق خدا کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے، ـــــ اَلْحَقُّ يَنْطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ ـــــ عمرؓ قدرت کی زبان ہے، لیکن ہر شخص کائنات کے اسرار کو نہیں سمجھ سکتا،

اس لئے جب صحابہ کرام نے حضرت عمر رضؓ جیسے ہوش مند اور مدبر صحابی کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے ، اور کہنے لگے ، اے سالم! رسول اللہ صلعم کے صحابی کو بلاؤ ، صحابی تو بہت تھے مگر ——— یہاں وہ صحابی مراد تھے جو رسول اللہ صلعم کے بعد امت کے ذمہ دار تھے۔

وفات کے وقت حضرت ابوبکر رضؓ مدینہ میں موجود نہ تھے ، بلکہ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر اپنے سسرالی مکان میں چلے گئے تھے ، پیر کے روز صبح کو جب حضور صلعم کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی تو اس وقت ابوبکر رضؓ نے آپ کی قابلِ اطمینان حالت کو دیکھ کر اجازت چاہی تھی کہ آپ فرمائیں تو میں اپنے گھر چلا جاؤں - یہ گھر مقام (سخ) مدینہ کے بالائی حصہ میں تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع تھا - جہاں آپ کی انصاری بیوی رہا کرتی تھیں۔

ادھر صحابہ کرام آپ کی تلاش میں سرگرداں تھے ادھر ابوبکر رضؓ خبر سنتے ہی فوراً دوڑتے ہوئے آئے اور سیدھے حجرۂ عائشہ رضؓ میں تشریف لے گئے۔

ابوبکر رضؓ کا سانس چڑھا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے حضور صلعم کے پاس جا کر دوزانو بیٹھ گئے ، چہرہ منور سے مبنی چادر ہٹائی اور پیشانی چومی اور والہانہ انداز سے اپنا چہرہ حضور صلعم کے چہرۂ اقدس

پر رکھ دیا۔ روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ ——————

مَا اَطْيَبَكَ حَيًّا وَّمَيِّتًا - (بخاری) —————— حضورؐ آپ کیا ہی پاکیزہ ہیں، زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی"۔

پھر کہا —— وَاللّٰهِ لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ عَلَيْكَ مَوْتَتَيْنِ اَمَّا الْمَوْتَةُ الْاُوْلٰى الَّتِىْ كُتِبَتْ عَلَيْكَ فَقَدْ مِتَّهَا (بخاری) خدا کی قسم، آپ پر خدا تعالیٰ دو موتیں طاری نہیں کرے گا۔ سوائے اس موت کے جو آپ پر طاری ہو چکی۔

ابوبکرؓ کے قول کی تشریح

"خدا تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا"۔ ابوبکرؓ صدیق کے اس قول کی تشریح میں متعدد اقوال ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر اندازہ لگائیے کہ ابوبکرؓ صحابۂ کرام میں علمی حیثیت سے بھی کیسے جلیل القدر صحابی تھے۔

پہلی تشریح —————— حضرت ابوبکرؓ نے عمر فاروقؓ کے اعلان کی تردید کے طور پر یہ جملے ارشاد فرمائے، اور یہ تمہید تھی اس تقریر کی جو ابوبکرؓ اس کے بعد کرنے والے تھے، مقصد یہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو حضرت عزیر علیہ السلام کی طرح سو سال تک مردہ رہنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ —————— بقرہ ۳۵ "۔ اور نہ بنی اسرائیل کے ستر سرداروں

کی طرح بے ہوش ہوئے ہیں، جنہیں بعد میں خدا تعالیٰ نے زندہ کیا تھا، ثُمَّ بَعَثْنَاکُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ ـــــــ

دوسری تشریح ـــــــ ان جملوں میں حیات النبی کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد عالم برزخ میں زندہ کیا جاتا ہے اور سوال وجواب کے بعد پھر موت طاری کر دی جاتی ہے۔ یہ صورت آپ کے ساتھ نہیں ہوگی بلکہ آپ برزخ میں ایک ممتاز زندگی کے ساتھ قیام پذیر رہیں گے۔

تیسری تشریح ـــــــ ان جملوں میں ابوبکرؓ نے ـــــــ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ـــــــ کے مطابق یہ پیشین گوئی کی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے ساتھ آپ کی شریعت پر موت طاری نہیں ہوگی، جس طرح آپ سے پہلے ہوا کہ ہر پیغمبر کی وفات اس کے پیغام کی وفات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یعنی آہستہ آہستہ اس کی شریعت امت کے ہاتھوں مسخ ہونی شروع ہوگئی اور ایک وقت وہ آیا کہ یہ پہچاننا مشکل ہوگیا کہ یہ شریعت الٰہی ہے یا انسانی خرافات کا مجموعہ۔

چوتھی تشریح ـــــــ بعض نے کہا ہے کہ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ حضورؐ کو طبعاً جو کچھ تکلیفیں پہنچی تھیں وہ بیماری کے ایام میں

پہنچ گئیں۔ اب اس کے بعد نہ کوئی تکلیف ہے نہ غم۔ (ابن حجر)

ابوبکرؓ کا خطبہ

"تاریخ بتاتی ہے کہ ان قیامت خیز حالات میں ابوبکرؓ و عباسؓ سے زیادہ کوئی شخص ثابت قدم ثابت نہ ہوا، پھر ان دونوں میں بھی حضرت ابوبکرؓ نے خاص طور پر جس حسن تدبیر کے ساتھ حالات پر قابو پایا بس وہ ابوبکرؓ ہی کا کام تھا۔ اور یہ اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ صحابہ کرام میں ابوبکرؓ صدیق کے سوا کوئی دوسرا شخص حسن تدبیر، معاملہ فہمی اور صحابہ کرام میں اثر ورسوخ کے لحاظ سے خلیفہ بننے کے قابل نہیں تھا،

حضرت ابوبکرؓ حجرۂ عائشہؓ سے باہر تشریف لائے۔ دیکھا کہ حالات بہت نازک ہیں، ممبرِ رسول پر تشریف لے گئے، ممبر پر بیٹھتے ہی بے باکانہ جرأت کے ساتھ للکار کر فرمایا۔

ایھا الحالف علی دسلک اے قسم کھانے والے ذرا ٹھیر۔

یا تو عمر فاروقؓ ننگی تلوار سونتے ہوئے اعلان کرتے پھر رہے تھے یا ابوبکرؓ کی للکار نے عمرؓ کو لرزہ براندام کردیا۔

ابوبکر نے خطبہ شروع کیا اور فرمایا۔

اَلَا مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَ — خبردار! لوگو سنو، جو شخص تم میں سے محمدؐ کی بندگی کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہئیے

مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ	کہ محمدؐ وفات پا گئے اور جو شخص خدا کی بندگی
اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ ، قَالَ	کرتا ہے سو وہ سن لے کہ خدا تعالیٰ زندہ ہے
اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا	جسے موت نہیں آتی ، خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے
رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ	محمدؐ صرف خدا کے رسول ہیں ان سے پہلے بھی
الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ	بہت سے رسول آئے اور چلے گئے (اسی طرح
قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ	ہمارے رسول بھی آئے اور چلے گئے) تو کیا
وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ	اگر خدا کا رسول وفات پا گیا یا وہ شہید کر دیا
فَلَنْ يَضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ	گیا تو لوگ اپنی ایڑیوں کے بل دین حق سے
قَالَ تَعَالٰى إِنَّكَ مَيِّتٌ	پھر جائیں گے ۔ جو شخص دین سے پھر جائے گا ۔
وَّإِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ وَقَالَ وَمَا	سو وہ یقین کرے کہ خدا تعالےٰ کو ذرہ برابر
جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ	نقصان نہیں پہنچا سکتا ۔ اور نیز خدا تعالیٰ نے
الْخُلْدَ (بخاری وابن ابی شیبہ	فرمایا ہے ، اے پیغمبر آپ بھی وفات پانے والے

ہیں ، اور آپ کے دشمن بھی ، نیز فرمایا ہے ۔ اے نبی ! تم سے پہلے بھی ہم نے کسی انسان کو دائمی زندگی عطا نہیں کی ——————

صدیق اکبر رضؓ کی اس بصیرت افروز تقریر کو عمر رضؓ نے نہایت غور کے ساتھ سنا ، خود فرماتے ہیں :" اس تقریر کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میرا جوش وخروش فرو ہو گیا ، میرے پیر بوجھل ہو گئے یعنی مجھ سے

اٹھانہ گیا۔ اور میں مارے ندامت کے دوہرا ہوئے جاتا تھا مجھے اس وقت یقین ہوا کہ حضورؐ وفات پاگئے۔ (ابن ابی شیبہ بخاری)

ابن عباس فرماتے ہیں، عام صحابہ کی حالت یہ تھی کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آیت ابھی ابھی نازل ہوئی ہے، گویا اس سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ قرآن کریم میں یہ آیت بھی موجود ہے، جب مجمع منتشر ہوا تو ہر شخص کی زبان پہ یہ آیت جاری تھی۔ (ماثبت بالسنۃ)

حضرت عمرؓ کا اپنی تقریر میں اعتراف

سقیفہ بنی ساعدۃ میں صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے، فضیلت ابوبکرؓ پر فاروق اعظمؓ نے جو تقریر کی اس میں کہا۔

"لوگو! میں نے کل تم سے ایک ایسی بات کہی تھی، جو میں نے نہ کتاب اللہ میں پائی نہ سنت رسول اللہؐ میں، لیکن میں صرف یہ امید رکھتا تھا کہ حضورؐ ہمارے بعد تک زندہ رہیں گے اور ہمارے کاموں کی تدبیر فرماتے، اس لئے میں نے جو کچھ بھی کہا تھا، سو کہہ چکا، مگر خدا تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو اسے پسند تھا، ہمارے پاس کتاب اللہ موجود ہے، اس سے تمہیں وہی ہدایت ہوگی، جو اس

کے رسول کو ہوئی تھی" ——— (طبری)

ابوبکر رض کی تقریر میں کیا تھا؟ جس نے عمر رض کو مطمئن کر دیا

حضرت عمر رض کو اس اندیشہ نے بیحد متاثر کیا تھا کہ کہیں منافقین اسلام کی قوت کو پائمال نہ کر دیں، مگر مگر جب صدیق اکبر رض نے اپنی تقریر میں اپنے فولادی یقین اور اذعانِ محکم کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ منافقین تو کجا اگر بالفرض بعض مخلص مسلمان بھی دین اسلام سے پھر جائیں تو وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ۔ کافر لاکھ ناک بھوں چڑھائیں خدا تعالیٰ اپنے دین کی روشنی مکمل کر کے چھوڑے گا۔

اس خطرہ کے علاوہ وفاتِ رسول ؐ کے صدمہ نے جو آپ کے دل و دماغ پر اثر کیا تھا وہ اس بات سے دور ہو گیا کہ دنیا میں کوئی انسان پائدار زندگی لے کر نہیں آیا۔ نہ کوئی پیغمبر نہ کوئی رسول سوائے حق تعالیٰ کے جو حی و قیوم ہے ——— پس وفاتِ رسول کوئی ایسی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ مسلمان جذبات میں قابو سے باہر ہو جائیں۔

علامہ شبلی کی رائے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمر رض کی

کی اس خودرفتگی کو ہر شخص تعجب کے ساتھ سنتا ہے، اور سُن کر دنگ رہ جاتا ہے، اس لئے علامہ شبلی مرحوم کے نزدیک فاروقِ اعظم کا یہ انکارِ وفات، کسی خودرفتگی کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ انہوں نے عقل و شعور کے ساتھ مصلحتاً یہ اعلان کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ منافقین کی فتنہ پردازی کو روک دیا جائے، علامہ کے نزدیک روایات کے تغیر نے موجودہ صورت اختیار کرلی ہے، ——— اور بس" ——— لیکن جس کے سامنے حالات کی اصل صورت ہوگی، اس کے نزدیک فاروق اعظم رضؓ جیسے مدبر کی یہ خودرفتگی بعید از قیاس نہیں رہ سکتی،

اور پھر جبکہ بقول علامہ شبلی مرحوم "بخاری اور مسلم کی تصریحات ایسی موجود ہیں۔ جن کے بعد اس قسم کا قیاس نہیں چلتا" ——— تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر بلا ضرورت اصل صورت حال کے خلاف اس قسم کی توجیہ کیوں کی جائے،

حضرت عثمان رضؓ اور عبداللہ ابن انیس رضؓ کی حالت

حضرت عثمان غنی رضؓ پر وفات رسول کے صدمہ سے سکتہ کی حالت طاری ہوگئی تھی، وہ پھرتے چلتے تھے مگر کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے، پورے ایک دن تک آپ پر خرس کی سی یہ کیفیت طاری رہی، دوسرے دن جاکر

کہیں بات چیت کرنی شروع کی۔

حضرت عبداللہ ابن انیس کے قلب کو ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ برداشت نہ کر سکے۔ اور وصال فرما گئے۔

فراقِ رسول ؐ پر ایک رباعی

حضرت علی رض کا صدمہ حضرت علی رض بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے، جیسے کسی صدمہ عظیم نے ان کی کمر توڑ دی ہو، چنانچہ ایک رُباعی میں انہوں نے اس طرح اپنے غم کا اظہار کیا ہے ؎

لِکُلِّ اِجْتِمَاعٍ مِنْ خَلِیْلَیْنِ فُرْقَۃٌ ... وَکُلُّ الَّذِیْ غَیْرَ الْفِرَاقِ قَلِیْلٌ
وَاِنَّ افْتِقَادِیْ فَاطِمًا بَعْدَ اَحْمَدٍ ... دَلِیْلٌ اَنْ لَا یَدُوْمُ خَلِیْلٌ

یہ رباعی حضرت علی رض نے حضرت فاطمہ رض کے وصال پر فرمائی تھی۔ رباعی کا خلاصہ یہ ہے، ہر دو دوستوں کے وصال پر فراق ضروری ہے، اور دوست کے فراق کی مصیبت کے سامنے تمام مصیبتیں ہیچ ہیں، حضور ؐ کے بعد حضرت فاطمہ رض کا وصال اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی دوست ہمیشہ رہنے والا نہیں۔

ابو ذویبؓ کا واقعہ

جنات کی آہ و پکار حافظ ابن عساکر نے ابو ذویب ھذلی کا ایک واقعہ خود ان کی زبانی نقل کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں، ——

میں اپنے قبیلہ میں تھا کہ ہمیں خبر پہنچی —— "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت نازک ہے" —— یہ جانکاہ خبر سن کر تمام لوگ گھبرا گئے، اور میرے لئے رات گزارنی مشکل ہو گئی۔ تمام رات مجھے نیند نہ آئی، صرف صبح کے وقت ذرا آنکھ لگی، آنکھ جھپکی ہی تھی کہ کیا سنتا ہوں کہ ایک کہنے والا یہ کہہ رہا ہے،

خطب اجل اناخ بالاسلام
بین النخیل ومعقد الاطام
قبض النبی محمد فعیوننا
تذری الدموع علیہ بالاسجام

ایک بڑا حادثہ رونما ہوا ہے جس نے اسلام کو بٹھا دیا ہے نخلستان اور سنگین مکانات کی نشست گاہ کے درمیان یعنی محمد رسول اللہ کی وفات ہو گئی پس ہماری آنکھیں ان کی وفات پر آنسو بہا رہی ہیں۔

جب میں نے یہ شعر سنے تو میں اپنی نیند سے اچھل پڑا اور میں سمجھ گیا کہ یا تو حضورؐ وفات پا گئے یا قریب الوفات ہو گئے، دوڑا دوڑا مدینہ آیا، کیا دیکھتا ہوں کہ مسلمان زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا

ہے کہ احرام باندھتے وقت حاجی تلبیہ پڑھ رہے ہیں، یہ نقشہ دیکھ کر میرے ہوش و حواس قابو میں نہ رہے ۔ ——— اور ابوذویب نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے متعلق یہ اشعار تو سنے مگر پڑھنے والا نظر نہ آیا۔ ظاہر ہے کہ پڑھنے والا کوئی مسلمان جن ہی تھا۔ جو اس حادثہ کبریٰ پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کر رہا ہوگا۔

حضرت بلال حبشی رضؓ رسول اکرم صلعم کے وہ سچے عاشق تھے جنہوں نے اپنے محبوب کے لئے وہ وہ مصیبتیں جھیلیں جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

دھوپ میں ننگے لٹائے گئے، سینے پر پتھر کی سلیں رکھی گئیں، شہروں نے پیروں میں رسیاں باندھ کر گھسیٹا، تمام جسم لہولہان ہو ہو گیا، مگر حضرت بلال رضؓ نے اس محبوب اعظم کے وصال کے مقابلہ میں یہ سب کچھ برداشت کیا، یہ منظور نہ کیا کہ اس پیارے آقا کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے نکال دیں، اور محمد عربی کے عشق سے دست بردار ہو جائیں

وصال محبوبؐ عالم معراج میں یقیناً جو وصال محبوب ان قربانیوں سے حاصل ہوا ہو وہ ایک ساعت کے لئے بھی فراق میں تبدیل نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ معراج کے سفر میں اس مقام پر جہاں کسی مقدس نبی کا بھی گزر نہ ہوا ———

حضرت بلال رضؓ اپنے محبوب کے ساتھ خادم بن کر آگے آگے چل رہے تھے۔ (بخاری)

جس نے پیغمبر کے وصال کی ہر قیمت ادا کی ہو، بھلا وہ عالم قدس کی سیر میں اپنے محبوب کی رفاقت سے کیوں محروم کیا جاتا ——؟

اس عشق و محبت کے بعد محبوب دو عالم کے فراق میں اگر بلال رضؓ دیوانہ بن کر دشت نوردی اختیار کر لیتے تو کچھ بعید نہ تھا۔ مگر بلال رضؓ کو اپنے محبوب کے دروازے سے صبر و ضبط کی جو دولت ملی تھی یہ اس کی آزمائش کا موقعہ تھا۔ بلال رضؓ اس میں کامیاب ہوئے، اور یہ ثابت ہو گیا کہ بلال ثبات و استقامت کے پیکر تھے، اور یہی ان کی زندگی کا روشن باب ہے۔

شوقِ وصال میں جہاد کی اجازت

حضرت بلال رضؓ پر فراق کی زندگی وبال تھی، مگر خودکشی حرام ہے۔ پھر کیا صورت اختیار کی جاتی کہ عاشق کو اپنے محبوب کا وصال نصیب ہوتا ——؟

دیکھئے حضرت بلال رضؓ اس کا کیا طریقہ سوچتے ہیں ——

وفات رسول کے بعد ایک دن حضرت ابوبکر رضؓ سے عرض کیا امیرالمومنین! آپ نے مجھے اپنی مصاحبت کے لئے آزاد کیا ہے یا خدا کے لئے ——؟

صدیق اکبر رضؓ نے فرمایا۔ صرف خدا تعالیٰ کے لئے — لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَاءً وَّلَا شُکُوْرًا — بولے، میں نے اپنے خلیل سے سنا ہے کہ مومن کا سب سے بہتر کام خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسی کارِ خیر کو اپنا مقصد بنا لوں اور اسی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دوں۔

بلال چاہتے تھے کہ اپنا پورا وقت میدانِ جہاد میں گزاریں تاکہ وہ مبارک ساعت بہت میسر آجائے، کہ بلال خدا کی راہ میں شہادت پاکر اپنے محبوب کا وصال حاصل کرلیں۔

بلالؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی قیمتی نشانی تھے، بھلا صدیق اکبر رضؓ جیسے محب رسولؐ بلال رضؓ کو ہمیشہ اپنے سے جدا — میدانِ جہاد — میں رہنے کی اجازت کیسے دیدیتے، — فرمایا، بلال رضؓ! میں تمہیں خدا اور اپنے حق کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم مجھے اس عالم پیری میں داغ مفارقت نہ دو — بتلائیے جس کا بات کبھی محبوب نے ٹھکرائی ہو، بلال اس کی بات کیوں کر ٹال دیتے بلال رضؓ نے فرمانِ صدیق کی تعمیل کی — (ابن سعد جز ثالث صفحہ ۱۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں تاخیر

روافض کا بے بنیاد الزام | اسے تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ کہیئے

یا اندھا تعصب کہ حضرت عمرؓ اور ابوبکرؓ پر یہ الزام لگایا جائے کہ یہ دونوں حضرات نبی اکرمؐ کو بے گور وکفن چھوڑ کر خلافت پر قبضہ کرنے چلے گئے، اور حضورؐ پیر کے دن وفات پائے ہوئے منگل اور بدھ کی درمیانی شب میں دفن ہوئے، پھر بھلا ان لوگوں کو آسمانِ اسلام کا مہرو ماہ کیوں تسلیم کیا جائے، اور کیوں کر انہیں خلافت کا اولین مستحق سمجھا جائے؟

بظاہر یہ بات بڑی سنگین ہے، لیکن ایک منصف مزاج مسلمان کی حیثیت سے معاملہ کی اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہمیں اس واقعہ کے پس منظر پہ غور کرنا پڑے گا۔

خود حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ——— "ہم لوگ حضورؐ کی وفات کے بعد آپ کے دولت کدہ میں بیٹھے ہوئے گریہ وبکا میں مصروف تھے یکایک ایک شخص نے دیوار کے پیچھے سے آواز دی۔ اے عمرؓ! ذرا باہر آؤ میں نے کہا، چلو ہٹو، ہم لوگ حضورؐ کے بندوبست میں مشغول ہیں، اس نے کہا، ایک بڑا حادثہ رونما ہوگیا ہے، سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہے اور وہ خلافت کے معاملہ میں کچھ گفتگو کر رہے ہیں جلدی چلو کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ مسلمانوں میں تلوار چل جائے، میں نے یہ سنکر ابوبکرؓ سے کہا، میرے ساتھ چلیئے۔" (مسند ابو یعلی)

یہاں پہنچ کر ان حضرات نے انصار کی جو حالت دیکھی وہ بہت

تشویشناک تھی ، یہ حضرات اپنے میں سے خلیفہ کا انتخاب چاہتے تھے ، حالانکہ عرب کے قومی حالات اور معیار خلافت کے اعتبار سے یہ کسی طرح مناسب نہ تھا ، کافی بحث وتمحیص کے بعد بھی جب معاملہ نہ سدھرا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مسلمانوں میں تلواریں نکل آئیں ، تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا ، ہاتھ بڑھایئے ، میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کا بیعت کرنا تھا ، کہ تمام اکابر صحابہ نے صدیق اکبرؓ کے کے ہاتھ پر بیعت کرلی —— یہ نقشہ تو انصار ومہاجرین کا تھا ——

تیسرا گروہ حضرات اہل بیت کا تھا۔ یہ سب حضرات ، حضرت فاطمہ رضؓ کے گھر میں جمع ہوئے ، کیونکہ ان لوگوں کا سقیفہ بنی ساعدہ میں جانا بیسود تھا۔ وہاں انصار ومہاجرین میں سے کوئی گروہ بھی حضرت علی رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار نہ تھا۔ لیکن جب ان حضرات کو معلوم ہوا کہ صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی گئی تو یہ سب کے سب حضرت فاطمہؓ کے گھر سے اٹھ کر چلے آئے ، اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ (طبری)

اب بتایئے کہ حضورؐ کو چھوڑ کر چلے جانے کا الزام کن کن لوگوں پر ہے ؟ روافض کے طعن کے مطابق نہ تو حضرت علی رضؓ اعتراض سے بچتے ہیں ، نہ حضرت عباس ، اگر شیخین حضورؐ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے تو اہل بیت کے ان بزرگوں سے کس نے کہا تھا کہ آپ بھی رسول اللہ صلعم

کو چھوڑ چھاڑ کر حضرت فاطمہ رض کے گھر میں جمع ہو جائیں۔

لیکن حقیقت حال کے اعتبار سے نہ تو حضرات شیخین پر کوئی الزام ہے نہ حضرت علی رض و عباس رض پر، اس لئے کہ وفات رسول ص کے بعد منافقین کی بے پناہ ریشہ دوانیوں اور مسئلہ خلافت پر مسلمانوں کے باہمی اختلاف کا ضروری تقاضا یہ تھا کہ فوراً خلافت کا انتظام کیا جائے۔

اگر یہ حضرات گریہ و بکاء میں مصروف رہتے اور فوراً ملت کی تنظیم کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو تاریخ اسلام کا وہ نقشہ نظر نہ آتا جو آج نظر آرہا ہے۔ یہ فاروق اعظم رض کے تدبر ہی کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر، سیاست، معاشرت اور تمدنی قوانین کا ایک مکمل عملی دستور العمل مسلمانوں کے پاس موجود ہے،

رضی اللہ تعالیٰ عنہم وعنا اجمعین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا انتظام

غسل کے بارے میں اختلاف

جب امت کے ذمہ دار اپنی کامیاب سعی سے امت میں پیدا شدہ افتراق کا انسداد کر چکے اور وہ لوگ ناکام و نامراد ہو گئے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئس سالہ جانفشانیوں کو ضائع کرنا چاہتے تھے،

توحضرات صحابۂ کرام حضورؐ کی تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، ــــــ جب صحابہ کرام نے غسل کا ارادہ کیا، توان میں باہمی اختلاف پیدا ہوگیا۔ بعض نے کہا حضورؐ کو غسل نہ دو۔ آپ توطیب و طاہر ہیں، بعض کی رائے ہوئی غسل تو دو مگر آپ کے کپڑے نہ اتارو۔

حضرت عباس رضؓ نے فرمایا ــــــ ہم کسی کی ذاتی رائے سے حضورؐ کی سنت کو کیسے چھوڑ دیں، یعنی میت کو غسل دینا پیغمبر خدا کی سنت اور آپ کا حکم ہے، جسے محض کسی کی عقیدت مندانہ رائے سے نہیں چھوڑا جا سکتا۔

غسل کے بارے میں غیبی رہنمائی

صحابہ کرام کے اس باہمی اختلاف کو حق تعالیٰ نے اپنی غیبی ہدایت سے دور کیا، حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، ــــــ صحابۂ کرام پر ایک اونگ سی طاری ہوگئی، اور ایک آواز دینے والے نے جو نظروں سے غائب تھا آواز دی ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں سمیت غسل دیدو۔

کس پانی سے غسل دیا گیا

ابن ماجہ کی ایک روایت میں ہے، ــــــ نبی کریم صلعم نے

حضرت علی رضؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ مجھے "بیر غرس" کی سات مشکوں سے غسل دینا۔

"بیر غرس" قبا میں ایک کنواں تھا، جس کا حضورؐ پانی پیا کرتے تھے، اس کنویں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب بھی روایتوں میں منقول ہے،

ایک روز آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت کے ایک کنویں پر گیا ہوں ——— صبح اٹھ کر حضورؐ بیر غرس پر تشریف لے گئے اس کے پانی سے وضو کیا۔ اور اس میں اپنا لعاب مبارک ڈالا۔ اور یہ ظاہر فرمایا کہ رات والے خواب کی یہی تعبیر ہے۔

کن حضرات نے غسل دیا

حضورؐ کی یہ بھی وصیت تھی کہ مجھے علی رضؓ کے سوا کوئی دوسرا شخص غسل نہ دے کیونکہ جس شخص کی نگاہ میرے ستر پر پڑ جائے گی وہ اندھا ہو جائے گا۔ (سیرت مغلطائی)

اس وصیت کے مطابق آپ کو صرف علی رضؓ نے غسل دیا۔ اگرچہ حضرت عباس رضؓ ان کے دونوں بیٹے۔ فضل اور قثم، اور حضورؐ کے خادم خاص حضرت اسامہ رضؓ اور حضرت شقران بھی حضرت علی رضؓ کے ساتھ شریک تھے، مگر حضرت علی رضؓ نے کپڑے کا ایک پردہ

تان رکھا تھا، اور سب کی آنکھوں پہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔
حضرت عباس رضؓ کروٹ دلانے میں حضرت علی رضؓ کی مدد کرتے تھے۔ اور حضرت عباس رضؓ کے دونوں صاحبزادے پانی ڈال رہے تھے اور دونوں خادم پانی لالاکر دے رہے تھے، کرتا آپ کے جسم پر موجود تھا، اسی کے اوپر پانی ڈالا جاتا تھا۔ اور حضرت علی رضؓ اوپر سے ملتے جاتے تھے۔

اوس بن خولی کو غسل دینے میں شریک کرلیا

جس وقت اہل بیت کرام نبی اکرمؐ کو غسل دے رہے تھے اوس ابن خولی انصاری نے باہر سے حضرت علی رضؓ کو آواز دی اور کہا، اے علی رضؓ! میں تم سے خدا کے واسطے رسولؐ کی خدمت میں اپنا حصہ مانگتا ہوں، حضرت علی رضؓ نے اوس کی بے تابی اور محبت کو دیکھ کر اسے اندر آنے کی اجازت دیدی، لیکن شریک نہ کیا۔ بعض کہتے ہیں، یہ بھی پانی لالاکر دے رہے تھے۔

ماءِ غسل سے برکت اندوزی

حضرت علی رضؓ کا واقعہ

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

اقدس سے مختلف طریقوں سے برکت اندوز ہوتے رہتے تھے

کسی نے حضرت علی رضؓ سے سوال کیا آپ کو یہ فہم اور حافظہ کس طرح نصیب ہوا ؟ فرمایا جب میں حضورؐ کو غسل دے رہا تھا تو جو پانی آپ کی پلک چشم میں جمع ہو جاتا تھا میں اسے اپنی زبان سے اُٹھا لیا کرتا تھا، اور پی جاتا تھا، میں جانتا ہوں کہ یہ قوت حافظہ اسی پانی کی برکت کا نتیجہ ہے۔ (شواہد النبوۃ)

وفات کے بعد سینۂ اطہر کی خوشبو

حضرت ام سلمہ کا واقعہ حضرت ام سلمہ رضؓ فرماتی ہیں۔ میں نے وفات کے روز آپ کے سینہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے ہیں، میں برابر اس ہاتھ سے کھانا کھاتی ہوں اور دوسرے کام بھی کرتی ہوں، مگر آج تک میرے ہاتھ سے مشک کی خوشبو نہیں گئی۔

بچّوں کو برکت کے لئے لانا

زہرہ رضؓ ابن معبد کا واقعہ زہرہ ابن معبد کو بچپن میں ان کی والدہ حضورؐ کی خدمت میں لائیں اور کہا،

اس سے بیعت لیجئے ، آپ نے فرمایا " ابھی بچہ ہے " یہ کہہ کران کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی ،

چنانچہ ان کے دادا جب غلہ خریدنے جاتے تھے تو انہیں ساتھ لے جاتے تھے "تاکہ برکت ہو ، حضرت ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ سے ملاقات ہوتی تھی ۔ تو یہ حضرات فرماتے تھے " ہم کو بھی شریک کرلو ۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے تم کو برکت کی دعا دی ہے ۔

حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں ۔

وتوفر دواعی الصحابة علی احضاراولادھم عندالنبی صلعم لالتماس برکتہ ۔	اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ سے برکت حاصل کرنے کے لئے صحابہ کرام کو آپ کی خدمت میں اپنی اولاد کے حاضر کرنے کا بڑا شوق تھا ۔

حضور کبھی بچوں کے منہ میں کُلی کر دیتے ، بعض کے منہ میں لعاب دہن ڈال دیتے ، اور کبھی وضو کا بچا ہوا پانی پلا دیتے ۔ (بخاری)

برکت حاصل کرنے کے مختلف واقعات

نماز فجر کے بعد صحابہ کرام کے ملازم برتنوں میں پانی لے کر حاضر ہوتے ، آپ ان میں دست مبارک ڈال دیتے ، وہ تبرک ہو جاتا (مسلم)

جب پھل پختہ ہو جاتے تو صحابہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے آپ برکت کے لئے دعاء فرماتے، اور اس وقت جو بچہ سب سے چھوٹا ہوتا اسے دیدیتے۔ (ترمذی)

ایک روز آپ نے وضو کیا، پانی بچ گیا، تو صحابہ نے اس کو لے کر اپنے تمام جسم پر مل لیا۔ (بخاری)

ایک بار آپ سر منڈوا رہے تھے، صحابہ نے آپ کو گھیر لیا۔ حجام سر مونڈتا جاتا تھا اور صحابہ بالوں کو اوپر ہی اوپر اچک لیتے تھے۔ (مسلم)

حضرت عائشہؓ کے پاس آپ کا ایک جبہ محفوظ تھا، ان کے انتقال کے بعد وہ جبہ حضرت اسماء کے پاس آگیا، حضرت اسماء بیماروں کی شفایابی کے لئے اس جبّہ کو دھوکر بیماروں کو پانی پلاتی تھیں (ابوداؤد)

حضرت امیر معاویہ رضؓ کے پاس آپ کی ایک قمیص، ایک تہبند، ایک چادر، اور چند موئے مبارک تھے، انہوں نے وفات کے قریب یہ وصیت کی کہ یہ کپڑے کفن میں لگائے جائیں۔ اور موئے مبارک منہ اور ناک میں بھر دیئے جائیں۔ (بخاری)

آپ کے چند بال حضرت ام سلمہ نے بطور یادگار کے محفوظ رکھے تھے، اور جب کوئی شخص بیمار ہوتا تو ایک برتن میں پانی بھر کر بھیج دیتا اور وہ اس میں بالوں کو دھوکر واپس کر دیتیں۔ جس کو وہ پی جاتا تھا یا اس سے

غسل کر لیتا تھا۔ (بخاری)

مصنوعی تبرکات

ان واقعات کے بعد یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ کے تبرکات سے فیض و برکت حاصل کرنا خلاف شریعت ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس چیز کو لوگ تبرک کہہ دیں، مسلمان اسی کی تعظیم شروع کر دیں، کیا آج ہندوستان میں ہزاروں جگہ " قدم رسول ؐ " " موئے مبارک " اور دوسری بے شمار یادگاروں کی مشرکانہ تعظیم نہیں ہو رہی، جبکہ تاریخ میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔؟

حضور ؐ کے آخری تبرکات اور ہلاکو خاں کی غارتگری

"تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس آپ کے جو آخری تبرکات رہ گئے تھے انہیں ہلاکو خاں نے نذر آتش کر دیا تھا۔ یہ آخری تبرکات، حضور ؐ کا عصائے مبارک، اور حضور ؐ کی چادر تھی، جو خلفائے عباس کے پاس توارثاً چلی آ رہی تھی۔ یہ نام نہاد خلفاء اسلام شاہانہ اجتماعات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا ہاتھ میں لے کر اور چادر کندھے پر ڈال کر شریک ہوتے تھے، جب ہلاکو نے اس نام نہاد عباسی خلافت کو اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے ظلم و ستم کا شکار بنایا تو ساتھ ساتھ ان تبرکات کو بھی آگ میں جلا دیا۔

اور کہا ———— " میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کی یہ سخت توہین سمجھتا ہوں کہ عیش پرست بادشاہ ان مقدس یادگاروں کو اپنے اغراض مذمومہ کے لئے استعمال کریں"

"تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ ان تبرکات کے ضائع ہوجانے کے بعد مسلمانوں کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اور تبرک باقی رہا ہو۔

تبرکات کے معاملہ میں صحابۂ کرام کی احتیاط

پھر اس کے علاوہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں حضرات صحابہ رضؓ کو ذات رسولؐ کے ساتھ بے پناہ عشق تھا اور اس کی وجہ سے وہ اپنے محبوب کی ہر چیز کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے وہاں وہ توحید جیسی متاع گراں کو بھی نقصان پہنچانے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ وفات رسولؐ کے بعد جب مسلمانوں نے اس کیکر کے درخت کی زیارت کے لئے دور دور سے آنا شروع کیا۔ جس کے نیچے بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی تھی۔ اور خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضؓ نے یہ اندیشہ محسوس کیا کہ اگر زیارت کا یہی اہتمام رہا تو مسلمانوں میں یادگار پرستی اور پھر اس سے "رسول پرستی" شروع ہوجائے گی۔ تو آپ نے حکم دیا کہ اس درخت کو کاٹ ڈالا جائے۔

درخت کٹوا دیا گیا۔ اور کسی بڑے سے بڑے عالم اور فقیہ صحابی نے اس فعل پر تنکیر نہ کی۔

نبی اور غیر نبی کے تبرک میں کیا فرق ہے؟

جب صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند تبرکات کے بارے میں اس قدر احتیاط ملحوظ رکھتے تھے تو بھلا غیر نبی یعنی اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے تبرکات کی تعظیم کے مسئلہ میں ایسی آزادی کیسے دی جا سکتی ہے، جو آج کل مسلمانوں نے اختیار کر رکھی ہے ـــــــ اس لئے کہ نبی اور غیر نبی کے تبرک میں زمین آسمان کا فرق ہے، نبی جس طرح معصوم و مقبول ہوتا ہے، اسی طرح نبی کا صاحب فیض و برکت ہونا بھی یقینی ہوتا ہے۔ برخلاف ایک امتی کے ـــــ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو ــــ کہ ـــ نہ اس کا مقبول ہونا قطعی ہوتا ہے اور نہ صاحب برکت ہونا یقینی قرار دیا جا سکتا ہے، صرف اپنے گمان سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں بزرگ مقبولِ بارگاہ ہیں۔

عثمان ابن مظعونؓ اور اُمِ علاء انصاریہ کا واقعہ

چنانچہ حضرت عثمان ابن مظعونؓ کی وفات پر مشہور بزرگ صحابیہ حضرت اُمِ علاء انصاریہ رضؓ نے مرحوم کی تعریف

میں یہ جملے کہہ دیئے تھے، ــــــ رَحْمَةُ اللّٰہِ عَلَیْکَ یَا اَبَا السَّائِبِ فَشَهَادَتِیْ عَلَیْکَ لَقَدْ اَکْرَمَکَ اللّٰہُ ــــــ اے ابوالسائب! تم پر خدا کی رحمت ہو، میں گواہی دیتی ہوں کہ تمہیں خدا تعالیٰ نے اپنے کرم و فضل سے نواز دیا۔

اس پر حضورؐ نے فرمایا ــــ مَا یُدْرِیْکَ اِنَّ اللّٰہَ اَکْرَمَهُ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے انہیں بزرگی عطا فرما دی ــــ؟ عرض کیا، ــــــ فَقُلْتُ اَبِیْ وَاُمِّیْ اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَنْ یُکْرِمُهُ اللّٰہُ ــــــ؟ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ پھر وہ کون ہے، جسے خدا تعالیٰ بزرگی دیتا ہے ــــ؟ ــــ فرمایا ــــ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَرْجُوْا لَهُ الْخَیْرَ، وَاللّٰہِ مَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ ــــــ یعنی خدا کی قسم میں اس کے متعلق اچھائی کی صرف امید رکھتا ہوں۔ اور مجھے تو اپنے متعلق بھی یہ نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ حالانکہ میں خدا کا رسول ہوں۔ (بخاری)

مطلب یہ ہے کہ کسی کے متعلق یقین کے ساتھ مت کہو کہ وہ بزرگ ہے صرف امید رکھو کہ خدا تعالیٰ اُسے بخش دے گا، ــــــ علمائے کرام اور صوفیائے عظام محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نیاز مندی کو سامنے رکھ کر اپنے موجودہ طرزِ عمل کا جائزہ لیں، کیا دعویٰ پرہیزگاری کے

باوجود اپنے آپ کو خود منبع خیر و برکت بنا کر بٹھا دینا اور برکت تقسیم کرنے لگنا اسلامی اسپرٹ کے مطابق ہے؟ خاص کر ایسے حالات میں جبکہ امت مرحومہ شرک و بدعت کی سینکڑوں بیماریوں میں مبتلا ہے اور اس وجہ سے ضرورت ہے کہ بہت کافی احتیاط برتی جائے۔

تکفین رسول

ما ثبت بالسنة میں شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دینے کے بعد آپ کے اعضاء سجود پر خوشبو لگائی گئی، اور عود کی دھونی دی گئی — پھر آپ کو اٹھا کر ایک تخت پر لٹا دیا گیا، اور اوپر سے ایک کپڑا ڈھانپ دیا گیا، اس کے بعد تکفین کا انتظام ہوا"

گو آپ کی تکفین کے بارے میں روایات مختلف ہیں، جس کی وجہ سے کپڑوں کی تعداد اور نوعیت میں محدثین اور فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن محققین کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ حضورؐ کو تین کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا۔ جس میں نہ عمامہ تھا، نہ قمیص، دو چادریں سفید تھیں اور ایک چادر یمنی تھی۔

اس کی تائید میں حضرت عائشہ رضؓ کا یہ قول پیش کیا گیا ہے۔
جس میں حضرت ابوبکر نے اپنے کفن کے لئے تین چادروں کی وصیت فرمائی ہے۔

عائشہ رضؓ فرماتی ہیں ـــــــ " جب میرے والد ابوبکر رضؓ بیمار پڑے تو میں ایک روزان کے پاس گئی، میں نے دیکھا کہ آپ پر ایک چادر پڑی ہوئی ہے۔ جس پر زعفران کے دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ میرے والد نے فرمایا ـــــ عائشہ رضؓ! اسی چادر کو دھو کر ایک تو اسی کو میرے کفن میں استعمال کرنا۔ اور دو چادریں اور سے لینا۔ میں نے عرض کیا، اباجان! یہ چادر تو پرانی ہے ـــــ فرمایا ـــــ زندہ آدمی مردے سے زیادہ نئے کپڑوں کا محتاج ہوتا ہے۔

نمازِ جنازہ | اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضورؐ کے جنازے کی نماز میں کسی نے امامت نہیں کی۔ بلکہ صحابہ کرام کے مختلف گروہ یکے بعد دیگرے آتے تھے اور بغیر امام کے اپنی اپنی نماز پڑھ کو چلے جاتے تھے، جب مرد فارغ ہو گئے تو عورتوں نے آنا شروع کیا اور پھر عورتوں کے بعد لڑکوں نے آ کر نماز ادا کی ـــــ حضرت علی رضؓ نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس موقعہ پر فرمایا تھا، ـــــ لوگو! حضورؐ تمہارے امام تھے، اور اب بھی وہی تمہارے امام ہیں ـــــ صحابہ کرام کے علاوہ ملائکہ قدسین کا بھی تانتا بندھا ہوا تھا۔ جو آپ کے لئے دعائے خیر کرتے اور چلے جاتے۔

نمازِ جنازہ میں کیا پڑھا گیا | اہلِ بیت کرام تو نماز جنازہ ادا کر چکے تھے۔

لیکن جب صحابہ کرام نے نماز پڑھنی چاہی تو انہوں نے آپس میں گفتگو کی کہ کیا پڑھا جائے۔ ابن مسعود رضؓ کے مشورے سے لوگوں نے حضرت علی رضؓ سے پوچھا تو آپؓ نے یہ دعا تعلیم کی۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا، لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ الْبَرِّ الرَّحِيْمِ وَالْمَلَائِكَةِ الْمُقَرَّبِيْنَ وَالنَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَمَا سَبَّحَ لَكَ مِنْ شَيْءٍ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ عَلَى مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ

خدا تعالیٰ اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی درود بھیجو، الٰہی ہم حاضر ہیں خدمت گزار بن کر خدائے مشفق و مہربان کی رحمتیں، اور ملائکہ مقربین کی، تمام رسولوں کی صدیقین کی، شہداء، اور نیکوں کی، اور اس تمام کائنات کی جو اے رب تیری تسبیح کرتی ہیں، اے رب العالمین، ان سب کی طرف سے درود و سلام نازل ہو محمد رسول اللہ پر جو خاتم المرسلین ہیں، سردار انبیاء ہیں، امام اتقیاء ہیں۔ رب العالمین کے رسول ہیں، شاہد ہیں، بشیر ہیں، تیری ہی طرف تیرے حکم سے بلانے والے ہیں آفتاب روشن ہیں۔

وَسَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَإِمَامِ الْمُتَّقِيْنَ وَرَسُوْلِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الشَّاهِدِ الْبَشِيْرِ الدَّاعِيْ إِلَيْكَ بِإِذْنِكَ السِّرَاجِ الْمُنِيْرِ وَعَلَيْهِ السَّلَامُ۔

تدفین میں اختلاف صحابہ

نماز سے فارغ ہونے کے بعد صحابۂ کرام کے درمیان اس بات میں اختلاف ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں دفن کیا جائے۔ بعض کی رائے تھی کہ حضورؐ کو مکہ معظمہ میں دفن کیا جائے، بعض نے کہا، مدینہ طیبہ میں پھر بعض نے بقیع کے متعلق رائے دی اور بعض نے ممبر رسولؐ کے پاس ——— اس اختلاف رائے کو حضرت ابوبکر رضؓ نے دور فرمایا اور کہا ——— "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ نبی جہاں وفات پاتا ہے اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے۔ پس آپ کو اسی جگہ دفن کرو جہاں آپ نے وفات پائی ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اس حدیث کی تائید کی۔ اور صحابۂ کرام اس سے مطمئن ہو گئے۔ (ابن ماجہ و ترمذی)

قبر کیسی بنائی جائے؟ صحابہ کی مختلف رائیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے بارے میں مہاجرین کی رائے تو یہ تھی کہ "شق" بنائی جائے، اور انصار کی رائے یہ تھی کہ "لحد" یعنی بغلی قبر بنائی جائے، یہ اختلاف اس طرح دور ہوا کہ حضرت عباس رضؓ نے ایک شخص کو تو حضرت ابوعبیدہ رضؓ کے پاس بھیجا اور ایک کو ابوطلحہ رضؓ کے پاس اور حکم دیا کہ ان دونوں کو بلا لاؤ ابوعبیدہ [illegible] کے لئے "شق" کھودا کرتے تھے، اور ابوطلحہ رضؓ

انصار یہ رضو مدینہ کے لئے لحد بنایا کرتے تھے۔ ـــــــ عباس نے انھیں روانہ کرتے ہوئے، دعا کی، الہی! تو اپنے رسول ؐ کے لئے وہ کر جسے تو بہتر سمجھتا ہے، ـــــــ پھر اسی بات پر صحابہ کرام کا اتفاق ہو گیا کہ ان دونوں گورکنوں میں سے جو صاحب بھی پہلے تشریف لے آئیں گے۔ وہی اپنے مطابق قبر تیار کریں گے۔ اور اسی کو خدا کا منشا تصوّر کیا جائے گا، ـــــــ خدا تعالیٰ کو منظور یہ ہوا کہ نبی اکرم صلعم کے لئے لحد تیار ہو۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ تو گھر پر نہ ملے اور ابو طلحہ رضؓ تشریف لے آئے اور انھوں نے آپ کے لئے لحد تیار کی۔

قبر شریف میں کس نے اُتارا

حضرت علی رضؓ اور حضرت عباس رضؓ اور ان کے دونوں بیٹے قبر میں اُترے اور اوس ابن خولی کو بھی ان کی درخواست پر حضرت علی رضؓ نے شریک کر لیا۔ ان سب حضرات نے مل کر آپ کو قبر مبارک میں اتارا ـــــــ

ایک روایت میں آتا ہے کہ دنیا میں سب سے آخر میں جس شخص نے حضورؐ سے ملاقات کی وہ قثم ابن عباس رضؓ تھے، کیونکہ یہ قبر مبارک سے سب کے بعد میں نکلے تھے۔

قبر مبارک میں کیا بچھایا گیا

ایک سرخ رنگ کی نجرانی چادر تھی، جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اوڑھا

بھی کرتے تھے اور بچھایا بھی کرتے تھے، اور جو آپ کو غزوہ خیبر کی غنیمت میں سے ملی تھی۔ اس چادر کو آپ کے غلام شقران نے آپ کی قبر مبارک میں بچھا دیا۔ اور کہا ـــــ "خدا کی قسم! حضورؐ کے بعد اسے کون اوڑھ سکتا ہے۔؟"

لیکن اسے صحابۂ کرام نے اچھا نہیں سمجھا اور اسے نکال کر اس کی جگہ نو کچی اینٹیں بچھا دی گئیں، ـــــ اسی وجہ سے علماء نے قبر میں کپڑا بچھانے اور پکی اینٹیں استعمال کرنے کو مکروہ کہا ہے، ابن عساکر کی ایک روایت کے مطابق جب قبر مبارک میں مٹی ڈال دی گئی تو اس کے بعد حضرت بلال رضؓ نے سرہانے کی طرف سے ایک مشک پانی ڈالا۔ جو بہہ کر پائنتیوں تک پہنچا۔

قبر مبارک مسطح ہے یا مسنم

حضرت شاہ عبدالحق صاحب نے شوافع اور احناف کے اختلاف کے پیش نظر یہ لکھا ہے کہ اول اول تو نبی کریم صلعم کی قبر مبارک مسطح تھی مگر بعد میں اسے قدرے اونچا کر دیا گیا تھا، چنانچہ ابو داؤد اور حاکم کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ نے عہد معاویہ میں قاسم ابن محمد کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کی قبریں دکھائیں۔ وہ کہتے ہیں ـــــ "نہ وہ قبریں زیادہ بلند تھیں اور نہ بالکل زمین سے ملی ہوئی، بلکہ زمین سے

ایک بالشت کی مقدار بلند تھیں۔

امام محمدؒ نے ایک روایت حضرت ابراہیم نخعی سے بیان کی ہے، جس میں ایک شخص کا مشاہدہ بیان کیا ہے، وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے تینوں قبریں دیکھیں، وہ قبریں زمین سے اٹھی ہوئی تھیں اور ہر قبر کے بیچ میں شگاف تھا۔

شوافع کے استدلال کا جواب

رہی حضرت علی رضؓ کی وہ حدیث جس سے شوافع نے استدلال کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علی رضؓ کو ہر تصویر کے مٹانے اور ہر قبر کو برابر کرنے پر مامور فرمایا ——— تو یہ حدیث گو بالکل صحیح ہے مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جو قبر بہت زیادہ بلند اور پختہ تھی اسے برابر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ نہ ہر قبر کو، ——— پس قبر کا اتنا اونچا کر دینا کہ زمین سے ممتاز ہو جائے جائز ——— بلکہ افضل ہے۔

مزار مقدسہ کی موجودہ ہیئت

حضرت شاہ صاحب نے ماثبت بالسنۃ میں مزارات مقدسہ کا حسب ذیل نقشہ درج کیا ہے۔



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت کا شوق

خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینا بڑی عظیم الشان نعمت ہے جو انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جنہیں خدا تعالیٰ اپنے خصوصی الطاف سے نوازنا چاہتا ہے۔

" ایک روز صحابۂ کرام رضؓ نے عرض کیا، ——— حضورؐ آپ ہر غزوہ میں شرکت کی تکلیف نہ فرمایا کیجئے، سفر کی صعوبتیں اور میدانِ جنگ کی سختیاں ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں۔ ہم آپ کے خدام اس خدمت کے لئے کافی ہیں۔" فرمایا " تم تو یہ کہتے ہو، اور میں چاہتا ہوں کہ اسلام وکفر کا کوئی معرکہ ایسا نہ ہو جس میں میں شرکت نہ کروں۔ لیکن کیا بتاؤں بعض دفعہ امت کے دوسرے مشاغل مجھے مدینہ میں قیام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور تمہیں میرے بغیر جانا پڑتا ہے۔" پھر فرمایا ——— " میرا دل تو یہ تمنا کرتا ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، اور پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔" یہ تین دفعہ فرمایا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت جلی کا درجہ کیوں نہ ملا؟ اس لئے کہ اگر آپ کفار کے ہاتھ سے میدانِ جنگ میں شہادت پا جاتے تو اس سے اسلام کی بڑھتی ہوئی شوکت کو نقصان پہنچتا۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت

غزوہ احد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوکر گڑھے میں گر پڑے تھے۔ جس پر شیطان نے یہ آواز بلند کردی تھی۔ اَلَا اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ ——— تو اس سے مسلمانوں میں اس قدر ابتری پھیل گئی تھی کہ بڑے بڑے جانباز صحابہؓ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے، اور حضرت عمرؓ جیسے بہادر کے حوصلہ پر اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ انہوں نے انس ابن نضرؓ سے کہا ——— جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وفات پا گئے۔ تو اب ہم بھی لڑ کر کیا کریں گے۔"

پس اگر پیغمبر خدا شہادت پا جاتے تو ایک طرف کفار کے حوصلے بڑھ جاتے اور دوسری طرف مسلمانوں کی ہمت ٹوٹ جاتی لیکن خدا تعالیٰ نے شہادت خفی کا مرتبہ عطا فرما کر اپنے نبی کی تمنا پوری کی۔ اور اس کے ذریعہ شہادت کا کامل درجہ مرحمت فرمایا۔

ایک یہودی عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا

شہادت خفی کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی وفات مظلومانہ وفات تھی، کیونکہ حضورؐ کی وفات کے وقت آپ پر اس زہر کے اثرات ظاہر ہو گئے تھے جو زہر آپ کو

خیبر میں دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ خیبر کی فتح کے بعد سلام ابن مشکم کی عورت زینب بنت الحارث نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بکری کا گوشت پکایا، اور اس میں زہر ملا دیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا نوالہ منہ میں رکھا، تو اس گوشت نے اللہ کے رسول کو مطلع کر دیا۔ کہ مجھ میں زہر ملا ہوا ہے، آپ نے فوراً تھوک دیا، لیکن بشر ابن براء ابن معرور — نے باوجود تلخی محسوس کرنے کے بے ادبی سمجھ کر تھوکنا پسند نہ کیا، اور زہر کے اثر سے ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے زینب کو بلا کر پوچھا، تو اس نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں نے آپ کو اس لئے زہر دیا کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ اور آپ بچ جائیں گے۔ اور اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہم آپ سے نجات پا جائیں گے۔

اس کے بعد وہ عورت اسلام لے آئی۔ امام زہری رح کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جب براء رض کا انتقال ہو گیا۔ تو آپ نے اس عورت کو قصاص میں قتل کرا دیا

(اصح السیر)

حضور ؑ کو شہادت کا درجہ ملا اس واقعہ کے تین سال کے بعد

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اس زہر کے اثرات نے آپ پر غلبہ حاصل کرلیا۔ یہاں تک کہ مرض وفات میں ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــــ

ماازالت اکلۃ خیبر	خیبر کا لقمہ ہمیشہ مجھے پریشان کرتا
تعاودنی فالآن اوان	تھا، سو اب رگ گردن کے انقطاع
انقطاع ابہری۔	کا وقت آگیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں ــــــ "صحابہؓ کرام جانتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ باوجود اس بزرگی کے جو آپ کو نبوۃ کے ساتھ عنایت ہوئی۔ (شفاء)

دعاء شفاء حضرت عائشہ رضؓ بیان فرماتی ہیں" جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کے اثرات سے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ تو آپ یہ دعا پڑھتے تھے

اذھب الباس رب	اے لوگوں کے رب اس تکلیف کو دور فرما
الناس واشف انت	تو شفا دے، تو ہی شافی ہے، بغیر تیری
الشافی لاشفاء الاشفاءک	شفاء کے کوئی شفاء نہیں تو مجھے ایسی شفا
لا یغادر سقما (متفق علیہ)	دے کہ وہ کسی مرض کو نہ چھوڑے۔

کیا شہادتِ حسنین رضؓ سے کمالاتِ محمدیؐ کی تکمیل ہوئی ہے ــــ معاذ اللہ

ابن اسحاق رضؓ کی روایت کے مطابق صحابہ کرام ؓ حضورؐ کے متعلق یہ جانتے تھے کہ آپ شہید ہوئے ہیں ۔ امام زہری رؒ کا قول تاریخ کے اندر موجود ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو شہادت کہا کرتے تھے ــــــــ پھر اس کے بعد قطعاً اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی شہادت سریہ اور جہریہ کے واسطے سے حضورؐ کے مراتب کی تکمیل کا نظریہ قائم کیا جائے ۔

سر الشہادتین واقعات شہادت اور حقیقت شہادت کے موضوع پر ایک مشہور کتاب ہے ۔ جسے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ۔ اس کتاب میں حضرت شاہ صاحب جیسے جلیل القدر محقق کی طرف نسبت کر کے لکھا گیا ہے کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب کمال میں تمام فضائل و مکارم کے باوجود ایک شرف موجود نہیں تھا۔ یعنی شہادت فی سبیل اللہ اور وہ اس لئے موجود نہیں تھا کہ میدانِ جنگ میں حضورؐ کی شہادت نبوت کی کسرِ شان تھی ۔ اور خدا تعالےٰ اپنے

نبی کی موجودگی ہی میں دین کو پروان چڑھانا چاہتا تھا۔ تو خدا تعالیٰ نے حضرت حسن رضؓ کو شہادت سریہ اور حضرت حسین رضؓ کو شہادت جہریہ عطا فرما کر اپنے نبی کے کمالات کے اس نقصان کی تلافی کر دی، ——— یہ خیال سراسر روافض کی فتنہ انگیزی ہے جنہوں نے حضرات حسنین رضؓ کی شہادت کو اہم سے اہم بنا کر پیش کرنے کے لئے اس کتاب میں اس مضمون کا الحاق کر دیا ہے۔

اور اگر بالفرض یہ تحقیق حضرت شاہ صاحب کی ہو بھی تو ہم اس سے متفق نہیں ہو سکتے۔ ہمارا ایمان قرآن وسنت پر ہے کسی عالم یا محقق پر نہیں۔ ہم تو اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات میں جملہ کمالات کے مجموعہ تھے اور آپ کی وفات ایک انسان کامل، افضل الرسل اور سردار دوجہاں کی وفات تھی، نہ ایک غیر مکمل فضائل والے نبی کی جس کے فضائل کو اس کی وفات کے بعد اس کے نواسوں نے مکمل کیا ہو۔

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دفن کے بعد حضرت فاطمہؓ کی حالت

وفات کے بعد حضرات صحابہ کرام کی غم انگیز.

داستان پڑھنے کے بعد بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ کا چہرہ مبارک صحابہ کی نظروں سے اوجھل ہوا ہوگا۔ اور حضرات صحابہ نے اپنے ہاتھوں سے حضورؐ کو جدا کیا ہوگا، تو اس وقت صحابہ کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔

حضرت فاطمہ رضؓ کے متعلق آتا ہے کہ آپ نے حضورؐ کے مزار مبارک کی مٹی اپنی آنکھوں سے لگائی اور حضرت انسؓ سے فرمایا۔ انس! تمہارے دل نے کیسے گوارا کر لیا کہ حضورؐ پر مٹی ڈالو ——— روتی جاتی تھیں اور یہ فرماتی جاتی تھیں۔ ——— انس رضؓ نے جواب دیا ——— اے رسول اللہ کی صاحبزادی! ہم کیا کریں۔ حکم الٰہی کے آگے مجبور تھے ——— اس کے بعد حضرت زہراؓ نے یہ شعر کہے۔

اناقفدناک فقد الارض وابلہا ——— وغاب مذ غبت عنا الوحی والکتب

فلیت قبلک کان الموت صادفنا ——— لما نغیب وحالت دونک الکتب

فرماتی ہیں۔ حضور! آپ ہم میں سے اس طرح تشریف لے گئے جس طرح زمین کی تری نکل جاتی ہے۔ آپ کیا تشریف لے گئے۔ خدا کی وحی اور کتابیں بند ہوگئیں۔ اے کاش آپ سے پہلے مجھے موت آجاتی اور آپ کے چھپ جانے سے قبل میں چھپ گئی ہوتی۔

کس پیرایہ میں حقیقت کا اظہار کیا ہے؟ یقیناً حضورؐ کی ذات گرامی

امت کے لئے ایسی تھی جیسی زمین کے لئے تری۔ زمین کی بدولت کھیت بڑھتے اور پکتے ہیں، باغات پھلتے اور پھولتے ہیں اسی طرح حضورؐ کی موجودگی نے امت کو ترقی کی معراج پر پہنچایا۔ جب تک حضورؐ رہے امت کا شجرہ طیبہ تہذیب و اخلاق کے شیریں پھل پھول لاتا رہا۔ اور اس سے دنیا فائدہ حاصل کرتی رہی۔ جب یہ ارتقاء حد کو پہنچ گیا تو "ہر کمالے را زوالے" کا فطری قانون مصروف عمل ہو گیا ـــــ بس ترقی ختم ہو گئی، اور زوال شروع ہو گیا ـــــ اس لئے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ جس اردو شاعر نے یہ کہا ہے۔ وہ غلط کہا ہے ؎

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے دنیا کی

حضرت فاطمہ رضؓ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی، جس کا تعلق محض عقیدت سے ہو بلکہ برکت کا اٹھ جانا، صحابہ کی آنکھیں محسوس کر رہی تھیں۔ ـــــ دیکھئے ـــــ

مہر نبوت اٹھ گئی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان چھوٹے پرندے کے انڈے کے برابر کچھ گوشت ابھرا ہوا تھا۔ اور اس پر صاف خط میں لکھا ہوا تھا۔ "محمد رسول اللہ" ـــــ

سائب ابن یزید کہتے ہیں ۔ ایک روز میری خالہ مجھے حضورؐ کی خدمت میں لے گئیں ۔ میں بچہ تھا ۔ عرض کیا ۔ حضورؐ! یہ میرا بھانجا بیمار رہتا ہے ۔ اس کے لئے دعاء برکت کیجئے ـــــــ آپ نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا ۔ اور میرے لئے دعاء فرمائی ـــ پھر وضوء کے لئے پانی منگایا ـــــ وضوء کیا ۔ اور مجھے وضوء کا بچا ہوا پانی پلایا ۔ اس کے بعد میں حضورؐ کی پشت کے پیچھے کھڑا ہو گیا ۔ اچانک میری نگاہ " خاتم نبوۃ " پر پڑی ۔ یہ پرندے کے چھوٹے انڈے کے برابر ابھرا ہوا گوشت تھا ۔ (بخاری)

اس " مہر نبوۃ " کے متعلق حضرت اسماء بنت عمیس کا بیان ہے کہ جب آپ وفات پا گئے تو میں نے اپنا ہاتھ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان رکھا ۔ لیکن میں نے مہر نبوت کو نہ پایا ـــــــ مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی حضور وفات پا گئے ۔

حضرت عائشہ رضؓ کے مرثیہ کے دو شعر

حضرت انس فرماتے ہیں ۔ حضورؐ کی وفات کے بعد جب میں حضرت عائشہ رضؓ کے پاس گیا تو میں نے سُنا کہ وہ رو رہی ہیں اور یہ شعر پڑھ رہی ہیں ؎

یا من لا یشبع من خبز الشعیر ۔ اے وہ ذات جس نے کبھی خشک روٹی سے بھی اپنا پیٹ نہیں بھرا

یا من اختار الحصیر علی السریر — اے وہ ذات جو بوریہ کو تخت پر ترجیح دیتی تھی۔
یا من لم ینم اللیل کلہ — اے وہ ذات جو کبھی تمام رات نہیں سوئی۔
من خوف عذاب السعیر — عذاب جہنم کے ڈر سے

حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کا مرثیہ

الا یا رسول اللہ کنت رجاءنا — ہاں یا رسول اللہ تم تو ہماری امیدوں کے مرکز تھے
وکنت بنا برا ولم تک جافیا — اور تم ایسے مہربان تھے کہ کبھی جفا نہیں کرتے تھے
وکنت رحیما ھادیا ومعلما — اور تم نہایت مشفق ہادی اور معلم تھے
لیبک علیک الیوم من کان باکیا — آج تم پر جو رونے والا ہے وہ رو لے
لعمرک ما ابکی النبی لفقدہ — قسم ہے تیری عمر کی میں نبی کو انکے گم ہو جانے کی وجہ سے نہیں روتی
ولکن لما اخشی من الھرج آتیا — بلکہ اس لئے روتی ہوں کہ آنیوالی لڑائی سے ڈرتی ہوں
کان علی قلبی لذکر محمد — گویا میرے دل پر محمدؐ کی یادگاری کے داغ ہیں
وما خفت من بعد النبی المکاویا — آپ کے حادثہ کے بعد مجھے کسی حادثہ کا خوف نہیں ہے
افاطم صلی اللہ رب محمد — اے فاطمہؓ! محمدؐ کا رب محمد پر رحمت بھیجے
علی جدث امسی بیثرب ثاویا — اس مزار مقدس پر جس نے مدینہ میں جگہ لی ہے
فدی لرسول اللہ امی وخالتی — رسول اللہؐ پر میری ماں اور خالہ قربان ہو
وعمی وخالی ثم نفسی ومالیا — اور میرا چچا اور ماموں پھر میری جان اور میرا مال

فلوان رب الناس ابقی محمداً — پس اگر لوگوں کا رب محمد کو زندہ رکھتا۔

سررنا ولکن امرہ کان ماضیاً — تو ہم بہت خوش ہوتے لیکن اس کا حکم ٹلنے والا نہیں

علیک من اللہ السلام تحیۃً — تم پر اللہ کا سلام اور رحمت

وادخلت جنات من العدن راضیا — تم تو بہشتوں میں دائمی زندگی کے ساتھ داخل کئے گئے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرثیہ

لما رأیت نبینا متجدلا — جب میں نے اپنے نبی کو زمین پر پڑا ہوا دیکھا

ضاقت علی بعرضھن الدور — تو تمام گھر باوجود فراخی کے مجھ پر تنگ ہو گئے

فارتاع قلبی عند ذاک لھلکۃٍ — اس وقت میرا دل مٹ جانے کو پسند کرنے لگا۔

والعظم منی ما حییت کسیر — میری ہڈیاں زندگی بھر ٹوٹتی رہیں گی

عتیق ویحک ان حبک قد ثوی — اے عتیق یعنی ابوبکر افسوس ہے کہ تیرا دوست چھپ گیا

فالصبر عنک لما بقیت یسیر — اب کیا تا بہ زندگی تیرے لئے صبر کرنا آسان ہے

یالیتنی من قبل مھلک صاحبی — کاش میں اپنے رفیق کے مرنے سے پہلے

غیبت فی جدث علی صخور — قبر میں پوشیدہ ہو جاتا اور مجھ پر پتھر پڑے گئے ہوتے

فلتحدثن بدائع من بعدہ — پس البتہ اس کے بعد ایسے ایسے عجیب حادثے پیدا ہونگے

یعیی بھن جوانح وصدور — کہ ان سے پسلیاں اور سینے تنگ ہو جائیں گے۔

حضرت عباسؓ کا مرثیہ

ارقت فبت همی لا یزول	میری نیند اڑ گئی سو میں ایسا ہو گیا ہوں کہ میرا غم نہیں جاتا
دلیل اخی المصیبة فیه طول	اور مصیبت زدہ کی رات طویل ہوتی ہے
واسعدنی البکاء وذاک فیما	رونے نے میری مدد کی یعنی میں بہت رویا
اصیب المسلمون به قلیل	مسلمانوں کی اس مصیبت سے میرا رونا اب بھی کم ہے۔
لقد عظمت مصیبتنا وجلت	بے شک ہماری مصیبت بڑی ہے اور ظاہر ہے
عشیة قیل قد قبض الرسول	اس رات کو کہا گیا حضورؐ وفات پا گئے
واضحت ارضنا مما عراها	ہماری زمین اس مصیبت کے باعث جس نے اس زمین کو ڈھانک لیا ہے
تکاد بنا جوانبها تمیل	قریب ہے کہ اس زمین کے اطراف ہم پر جھک پڑیں۔
فقدنا الوحی والتنزیل فینا	ہم نے وحی اور تنزیل کو گم کر دیا
یروح به ویغدو جبرئیل	جس کو جبریل ہم میں صبح اور شام لاتے تھے
وذاک احق ما سالت علیه	یہ مصیبت اس بات کی حق دار ہے کہ
نفوس الناس او کادت تسیل	لوگوں کے دل پگھل پڑیں اور پگھلتے رہیں
نبی کان یجلو الشک عنا	وہ ایسے نبی تھے جو ہم سے شک کی بیماری کو دور کر دیا کرتے تھے
بما یوحی الیه وما یقول	اس وحی کے ذریعہ جو ان پر آتی تھی اور اپنے ارشادات سے
ویهدینا فلا نخشی ضلالا	وہ ہمیں راہ دکھاتے تھے اور ہم گمراہی سے اندیشناک نہ تھے

علینا والرسول لنا دلیل	کیونکہ رسول اللہ ہمارے راہ بر تھے
افاطمہ ان جزعت فذاک عذر	اے فاطمہؓ اگر تو بے صبری کا اظہار کرے تو یہ بجا ہے
وان لم تجزعی ذاک السبیل	اور اگر تو صبر کرے تو یہ بہتر راستہ ہے
فقبر ابیک سید کل قبر	پس قبر تیرے باپ کی سب قبروں کی پیشوا ہے
وفیہ سید الناس الرسول	اور اس قبر میں سب لوگوں کے پیشوا رسول موجود ہیں

حضرت حسان ابن ثابت کا مرثیہ

کنت السواد لناظری	میری آنکھوں کی سیاہی تم ہی تھے
فعمی علیک الناظر	اب تم پر میری آنکھیں اندھی ہو گئیں
من شاء بعدک فلیمت	آپ کے بعد جو چاہے مرے
فعلیک کنت احاذر	میں تو آپ ہی کی وجہ سے محتاط رہتا تھا

(ماثبت بالسنہ)

آخری وصیتیں

آخری وصیتوں سے ہماری مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ارشادات ہیں۔ اور وہ ہدایات و احکام ہیں۔ جو آپ نے بطور وصیت کے اپنی بیماری کے ایام میں وقتاً فوقتاً صادر فرمائے۔ حضورؐ کی یہ آخری وصیتیں خدا کے پورے دین کا خلاصہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک مشفق باپ دنیا سے وداع ہوتے وقت اپنی پیاری اولاد ———— سے جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ اہم باتیں ہوتی ہیں۔ اسے نظر آتا ہے کہ میری محبت ختم ہو رہی ہے میری حفاظت و مہربانی سے میری محتاج اولاد محروم ہونے والی ہے۔ میرے بعد کون ان کا خیال رکھے گا۔ اور کون ان کے دکھ سکھ میں کام آئے گا۔

دنیا دار باپ مال و متاع کے متعلق وصیتیں کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرے بعد مال و دولت ہی ان کے کام آئے گی نہ بھائی بھائی کے کام آئے گا۔ نہ دوست دوست کے۔

لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی اولاد کی صرف دنیوی خوشحالی نہیں تھی آپ تو دین و دنیا دونوں کی کامرانی سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ مقصد اتنا عظیم اور پھر جدا ہونے والے باپ کی نظر اتنی وسیع کہ برائی یا بھلائی کا کوئی گوشہ اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ———— پھر بتایئے کیا کہا ہوگا، اور اس مشفق باپ نے کس قدر ضروری ہدایات دی ہوں گی؟

تقویٰ اور انصاف

حضرت ابن مسعود رضؓ فرماتے ہیں ———— جب وفات

قریب ہوئی تو حضورؐ نے ہم سب کو حضرت عائشہؓ کے مکان میں جمع کیا۔ اور فرمایا مرحبا بکم، اوصیکم بتقوی اللہ واستخلفہ تم سلامت رہو، میں تم کو تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں علیکم واحذر کم انی لکم نذیر مبین اور اسی کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں اور میں تمہیں ان لا تعلوا علی اللہ فی عبادہ وبلادہ ڈراتا ہوں اس بات سے کہ تم خدا کے بندوں میں اور اس کی زمین پر خدا کے مقابلہ میں بڑائی ظاہر کرتے نہ پھرنا۔

فانہ تعالیٰ قال لی ولکم تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا۔ والعاقبۃ للمتقین وقال الیس فی جہنم مثوی للمتکبرین۔ خدا تعالیٰ نے مجھ سے اور تم سے فرمایا ہے ہم آخرت کے گھر کی نعمتیں صرف انہیں لوگوں کو دینگے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد، اور انجام کی بہتری تو پرہیزگاروں کیلئے مخصوص ہے نیز خدا تعالیٰ نے فرمایا کیا جہنم متکبرین کا ٹھکانا نہیں ہے یعنی متکبر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

تقویٰ کی وسعت اخلاق اور سیاست کے آخری معلم نے اس جامعیت کے ساتھ اخلاق و سیاست کی مکمل تعلیم کا سبق دیا ہے کہ دین و دنیا کی تمام کامیابی اس میں سمٹ کر آ گئی ہے ——— یہ کہنے کو تو دو وصیتیں ہیں۔ مگر قانون و اخلاق کا بحر مواج اس ایک قطرہ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ——— پہلے تقویٰ کو لے لیجئے۔

اس منحوس دورِ غلامی میں مسلمانوں کی عملی قوتوں کے انحطاط کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی قوتوں میں بھی افسوسناک حد تک تنزل پیدا ہو چکا ہے ———

مسلمانوں کی عملی زندگی دین سے پھری سو پھری مسلمان نے تو دین ہی میں تحریف کرنی شروع کر دی ——— عملی روح سے خالی مسلمان نے یہ تو کوشش نہ کی کہ اس میں ازسرِنو عملی زندگی پیدا ہو جائے۔ بلکہ یہ جد و جہد شروع کر دی کہ اسلام ایسے قالب میں ڈھل جائے کہ ہماری بے عملی "بے عملی" نہ معلوم ہو۔ اور اسلام کو سامنے رکھ کر کوئی شخص ہماری زندگی پر اعتراض نہ کرے ——— بلکہ جو ہم کرتے رہیں وہی اسلام بنتا جائے ——— بتائیے اس مجرمانہ اقدام کے لئے مسلمان کو اسلام میں کس قدر تحریف کرنی پڑی ہو گی۔ اور اس میں کس قدر لوچ پیدا کرنے کی شیطانی کوشش کی گئی ہو گی۔

بس یہ ایک غلام قوم کی پستی کی انتہا ہے۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظا مما ذکروا بہ)

"تقویٰ" قرآن کریم کی نہایت اہم اصطلاح تھی۔ اس لئے مسلمانوں کی تحریف کا سب سے زیادہ شکار یہی بنا۔ ذرا خانقاہی دنیا کی سیر کرو۔ جب کہیں سے آواز آئے گی۔ تقویٰ اختیار کرو! ——— تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہنے والے کے نزدیک بھی اور سننے والے کے نزدیک بھی ——— کہ کم کھاؤ، کم بولو۔ کمبل پہنو اور اس گندی دنیا سے علیحدہ ہو کر کسی پاک گوشہ میں جا بیٹھو۔ بیمار ہو جاؤ تو

دواؤں کے پیچھے نہ پڑو۔ رات کو گھر میں چور آجائے تو اور آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ ——— یعنی تقویٰ، رہبانیت اور ترک دنیا قسم کی ایک چیز ہے اور بس ———

اس فریب خوردہ مذہبی دنیا پر ہنسی آتی ہے کہ ایک طرف تو تقویٰ کو اس قدر آگے بڑھا دیا۔ اور دوسری طرف یہ حالت ہے کہ قبروں کو سجدہ کرو تو تقویٰ نہ ٹوٹے ۔ غیراللہ سے اولاد اور مال مانگو تو تقویٰ نہ ٹوٹے ——— کیونکہ توحید کا تقویٰ سے کوئی تعلق نہیں۔

قوالی سنو تو تقویٰ میں فرق نہ آئے۔ اور بے پردہ ہو کر مردوں کے سامنے آؤ تو تقویٰ میں بال نہ پڑے۔ کیونکہ حیاء اور سنت کو تقویٰ کوئی لگاؤ نہیں۔

اس طبقہ سے آگے بڑھ کر جمود پسند مذہبی دنیا کو دیکھو تو وہاں یہ حالت ہے کہ چاشت اور اشراق میں فرق آجائے تو تقویٰ ٹوٹ جائے، تہجد نہ پڑھو تو تقویٰ باقی نہ رہے۔ غرضیکہ نوافل و مستحبات کی تکمیل پر تقویٰ کا حصول موقوف ہے ——— خواہ طاغوت کی خدمت میں کتنا ہی شغف ہو۔ باطل کی اطاعت میں کتنی ہی جان کھپائی جائے۔ انگریزی حکومت کے بقاء و استحکام کے لئے نماز کے بعد دعائیں ہی کیوں نہ کی جائیں۔ ———

—— اب غور فرمائیے کہ قرآن کریم تقویٰ کسے کہتا ہے۔

اسلام کے فوجداری نظام پر عمل کرنا تقویٰ ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ — تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقلمندوں۔ تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ (البقرہ)

جب قصاص کے قانون پر عمل کرنا تقویٰ ہے۔ تو اس پر تعمیل کرنے سے جو طاقت مانع ہو اس کو ہٹانے کی کوشش کرنا بھی تقویٰ ہے —— اور اس مخالف طاقت پر قناعت کرنا "فجور" اور اس کے ساتھ تعاون کرنا گناہ ہے۔

روزہ تقویٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ) — اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا

یہ بھی تقویٰ ہے کہ بدلہ لینے میں اپنے حق سے تجاوز نہ کیا جائے

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ۔ (البقرہ) — پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اس سے اتنا ہی بدلہ لو جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے تقویٰ اختیار کرو یقیناً اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔

عہد کی پابندی تقویٰ ہے۔

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَہْدِہٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ
(آل عمران ۷)

جو لوگ اپنا عہد پورا کریں اور تقویٰ اختیار کریں۔ تو بلاشبہ خدا تعالیٰ متقیوں کو محبوب رکھتا ہے۔

خانگی زندگی میں حسن سلوک تقویٰ ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمْ لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ ۔ ۔ ۔ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے۔ ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور جو تقویٰ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے راہ پیدا کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دیگا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

یعنی اگر حاملہ عورتوں کو طلاق دی جائے تو وضع حمل سے پہلے اس کو گھر سے نہ نکالو۔ اور اس اثناء میں نان نفقہ کی ذمہ داری تم پر ہے

امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور نیکیوں میں سابقت تقویٰ ہے۔

یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَاُولٰٓئِکَ مِنَ

وہ لوگ اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں اور نیکیوں کا حکم دیتے ہیں برائی سے لوگوں کو روکتے ہیں اور نیکیوں میں سابقت کرتے ہیں اور وہی لوگ نیکوکار ہیں اور وہ

الصّٰبِرِیْنَ وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ	لوگ جو بھی نیکی کا کام کریں گے اس کی ناقدری
خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْہُ وَاللّٰہُ	نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ متقی
عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ۔	بندوں کو جانتا ہے۔ (آل عمران)

تکبر کی جگہ تواضع اور فساد کی جگہ اصلاح کرنا تقویٰ ہے۔

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ	آخرت کے گھر کی بھلائیاں ان کے لئے مخصوص
نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ	ہیں جو زمین میں تکبر نہیں کرتے اور فساد نہیں
عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا	پھیلاتے اور انجام کار کی کامیابی انہی
وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ (قصص)	متقیوں کے لئے ہے۔

خدا کی زمین میں تکبر نہ کرنا اور فساد سے بچنا کیا ہے؟ ——

یہ سیاسی زندگی کی ایک بہترین نصیحت ہے جس پر اسلام کا نظام اجتماعی قائم ہے۔ اس کی تشریح ہم آگے چل کر کریں گے۔

سورہ بقرہ میں حق تعالیٰ نے متقیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے تقویٰ کے چند اعمال بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ	نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	کرلو یا مغرب کی طرف لیکن اصل نیکی اس شخص
وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ	کی جو خدا تعالیٰ پر ایمان لائے اور قیامت کے
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ	دن پر اور ملائکہ پر۔

وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ
ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ
وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ
اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي
الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ
الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ـ

اور تمام کتابوں پر اور تمام پیغمبروں پر اور
خدا کی محبت میں مال خرچ کرے۔ قرابت
داروں پر، یتیموں پر، مسکینوں پر، مسافروں
سوال کرنے والوں پر اور غلاموں کو آزاد
کرانے پر۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے
اور عہد پورا کرے۔ سختی اور بیماری میں صبر
کرے اور میدانِ جنگ میں بھی۔ یہ لوگ
اپنے ایمان میں سچے ہیں۔ اور یہی متقی ہیں

"حج" تقویٰ ہے

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعائر (ارکانِ حج)
کی عزت کرتا ہے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے

"عدل" تقویٰ ہے۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ) انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم تقویٰ ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ
عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ

بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی
آواز سے بولتے ہیں۔ وہی ہیں۔ جن کے

اَلَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ۔ (حجرات)	دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کر لیا ہے ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ ہے

اس تفصیل سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ تقویٰ شرعی اصطلاحات میں کس قدر جامع اصطلاح ہے جس کی وسعت سے شریعت کا کوئی عمل، اخلاق و تہذیب کی کوئی ہدایت اور قانون و سیاست کا کوئی گوشہ باہر نہیں ہے۔

تکبّر سے بچنے کی ہدایت

اب وصیت کے دوسرے جزو کو سمجھئے زمین پر تکبر نہ کرنا اور فساد نہ پھیلانا صرف یہ معنی نہیں رکھتا کہ خدا کی زمین پر اکڑ کر نہ چلو اور لڑائی جھگڑے سے بچو۔ — بلکہ یہ وصیت انفرادی زندگی سے لے کر سیاسی زندگی تک کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ لیکن ہم اس وقت اس وصیت کا صرف سیاسی پہلو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا تکبر جو تمام فسادات کی جڑ ہے سیاسی تکبر ہے —

جب انسان سیاسی اقتدار حاصل کرکے تخت شاہی پر جلوہ گر ہوتا ہے اور انا ربکم الاعلیٰ کا تصور اس کے دماغی توازن کو تباہ کر دیتا ہے۔ انسان اسے جانور نظر آتے ہیں۔ نہ غریب کا خیال اسے پریشان کرتا

ہے۔ نہ عوام الناس کی بھلائی اس کے فرائض میں رہتی ہے ——
تب خدا کی زمین پر ایک زبردست فساد رونما ہوتا ہے ——
اور زندگی کے ہر گوشے سے آہ وبکا کی آواز آنے لگتی ہے ——
انسانوں کا خون ارزاں ہو جاتا ہے۔ غریبوں کی جانیں حشرات الارض سے سستی ہو جاتی ہیں۔ انسان تو انسان جانوروں کو کہیں امن نہیں ملتا۔

غیر اللہ کی حکومت کا نقشہ

غرضیکہ جب انسان بندگی سے نکل کر آقائی کی حدود میں قدم رکھتا ہے اور انسان انسان کی غلامی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو پھر دنیا کا نقشہ یہ ہو جاتا ہے ؎

دشمنِ آدم، آدمی، ہم سخنے نہ ہمدمے
چشم کشا و یک دمے فتنۂ اہرمن نگر
آں ہمہ لغزش و خطا، ایں ہمہ سازش و دغا
خلوت اہلِ دیں بہ بیں، جلوت اہلِ فن نگر
بدعت و شرک و افتراق، فسق و فجور و ہم نفاق
جملہ بجسِ اتفاق، ہمدم و ہم سخن نگر
جسم زفاقہ زار زار، روح ز درد بے قرار
مادرِ ہند اشکبار، مفلسئ وطن نگر

آتش اسے تہرا شکار، برقِ عناد شعلہ بار
صورتِ شیخ را بہ بیں، سیرتِ برہمن نگر
خدمتِ بے سبب کجا، طاعتِ خاص رب کجا
سادگیٔ عرب کجا، خیز و در انجمن نگر

فرعون کی سیاسی حکمتِ عملی

"علو فی الارض" کی یہ تفسیر میں نے اپنی طرف سے نہیں کی کیونکہ میں تفسیر بالرائے کو مطلق حرام سمجھتا ہوں ——— بلکہ خود قرآن نے اس کا یہی مطلب لیا ہے ——— فرعون، جو "رب الاعلیٰ" ہونے کے گھمنڈ میں مبتلا تھا۔ اس کے متعلق فرمایا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ۔ (۲۸ — ۴)	بے شک فرعون نے ملک میں بڑی اقتدار کر لی ہے، اور اس نے ملک کے باشندوں میں تفریق ڈال کر الگ الگ گروہ بنا دیئے ہیں۔ اور وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کروا دیتا ہے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ بڑا مفسد ہے۔

غور کیجئے۔ اصل کبر کسے کہا گیا ہے ——— ایک انسان اپنی انفرادی زندگی میں بڑا متواضع ہو۔ نیچی نگاہ سے چلتا ہو۔

غریبوں سے ہنس کر بات کر لیتا ہو۔ سادہ لباس پہنتا ہو۔ مگر وہ خدا کے بندوں پر اپنا قانون چلاتا ہو۔ اپنی رائے سے حکومت کرتا ہو۔ اس کی حکومت خدا کی مرضی کے بجائے اس کی اور اس کے ارکان سلطنت کی مرضی پر قائم ہو ——— یقیناً وہ بڑا متکبر اور فرعون صفت انسان ہے ——— اس کے مسکین چہرہ کو دیکھ کر قرآن اسے کبر سے پاک نہیں کہہ سکتا۔ جبکہ اس نے خدا تعالیٰ کی کبریائی میں اپنے آپ کو شریک کر رکھا ہے۔ کیونکہ ———

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کبریائی زمین پر صرف خدا تعالیٰ ہی کا حق ہے۔

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ حکومت و فرمانروائی صرف خدا تعالیٰ کے لئے ہے جو بڑا بلند اور بزرگ ہے۔ (حاشیہ محمودہ ص ۲)

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں؟

اسلام مسلمانوں کا اقتدار نہیں چاہتا	پس حضور صلعم کی وصیت کا مطلب یہ ہوا... کہ مسلمان

کسی وقت بھی زمین پر اپنا اقتدار قائم نہ کریں کہ یہ سب سے بڑا فساد

وتکبر ہوگا ـــــ بلکہ ان کی کوشش ہمیشہ یہ ہونی چاہئیے کہ اللہ کی زمین پر ـــــ اللہ کے بندوں پر ـــــ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی حکومت بلا شرکت غیرے قائم ہوجائے جس حکومت کے ادنیٰ ترین خادم بن کر مسلمان بندگان الٰہی کی خدمت کریں۔

آپ چونک پڑے ہوں گے کہ اسلام مسلمانوں کا اقتدار نہیں چاہتا ہاں ۔مسلمانوں کا اقتدار نہیں چاہتا۔ وہ صرف خدا کا اقتدار چاہتا ہے مسلمان تو ایک ادنیٰ ترین خادم ہوتا ہے۔ انسانوں کا بلکہ کل کائنات کا ـــــ یہ اور بات ہے کہ شریف انسان اپنے بلا معاوضہ کے سچے اور ہمدرد خادم کی قدر کرتا ہے اور خود ہی اس کا بن داموں کا غلام بن جاتا ہے۔ اقبالؔ نے سچ کہا ہے ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

حاکمیت صرف خدا کے لئے ہے

پیغمبروں کا اعلان

اگر اسلام میں کسی انسان کی بندگی اور اقتدار کی گنجائش ہوتی تو اس کے سب سے زیادہ مستحق انبیاء علیہم السلام تھے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ان سے اعلان کرایا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ	جس انسان کو ہماری طرف سے، کتاب حکمۃ
اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَ	اور نبوۃ دی جاتی ہے اس کے لئے کسی طرح
النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ	مناسب نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کے
كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ	سوا میرے بندے اور غلام بن جاؤ۔ لیکن وہ یہ
اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ	کہتا ہے کہ خدا کی بندگی اور غلامی اختیار کر لو۔
(آل عمران ۸)	

اسلام میں خلیفہ کا منصب ایک نہایت بلند منصب ہے۔ ذرا اس منصب کی حیثیت ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت ابوبکرؓ کے خطبہ میں خلیفہ اسلام کی حیثیت

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ایک خطبہ دیا۔ جس میں فرمایا۔

یا ایھا الناس انی ولیت امرکم — لوگو! مجھے تمہاری حکومت کا سرپرست بنایا گیا ہے

ولست بخير منكم وان اقواكم	مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں میرے نزدیک
عندي الضعيف حتى آخذ	ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے
له بحقه وان اضعفكم	جب تک کہ اس کا حق اسے نہ دلوا دوں اور
عندي القوي حتى آخذ منه	قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے
ايها الناس ما انا الا كاحدكم	جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کر لوں لوگو!
فاذا رأيتموني قد استقمت	میری حیثیت تمہارے ایک معمولی فرد سے
فاتبعوني وان زغت فقوموني	زیادہ نہیں ہے اگر تم مجھے سیدھی راہ پر چلتا

دیکھو تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ میں ٹیڑھا ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔

حضرت عمر رض کا خطبہ اور خلافت اسلامیہ

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ کی حیثیت کو اپنے خطبہ میں اس سے زیادہ صحیح کیفیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

انما انا ومالكم كولي اليتيم	مجھے تمہارے مال سے صرف اتنا تعلق ہے جو
ان استغنيت استعففت	یتیم کے سرپرست کو یتیم کے مال سے ہوتا
وان افتقرت اكلت بالمعروف	ہے اگر میں خوشحال ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا
لكم علي ايها الناس خصال	اور اگر تنگدست ہوں گا تو اپنی ضرورت کے
تأخذوني بها۔	مطابق لوں گا مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور

لکم علی ان لا احتجن شیئا من خراجکم ولا مما افاء الله علیکم الا من وجهه ولکم علی اذا وقع فی یدی ان لا یخرج منی الا فی حقه

تم ان کا مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو۔ مجھ پر فرض ہے کہ تمہارے خراج اور مال غنیمت میں سے کوئی چیز بے جا وصول نہ کروں نیز یہ بھی حق ہے کہ جو کچھ میرے ہاتھ آئے اسے بے جا صرف نہ کروں۔

جناب نے غور فرمایا۔ جہاں خلیفہ اور پیغمبر کے لئے بھی شاہانہ طمطراق، حاکمانہ مطلق العنانی۔ مال و دولت کی فراوانی جائز نہ ہو اور جہاں خلیفہ رعیت کے ایک معمولی فرد سے کوئی بالاتر ہستی نہ ہو اور اسے نہ تخت عظمت پر بیٹھنا جائز ہو اور نہ وہ قانون کے خلاف ایک پتہ ہلا سکتا ہو۔ اور نہ اسے ایک چپہ بھر زمین پر قبضہ کرنے کا حق ہو بھلا اس مذہب میں "خلافت" خدمت انسانیت کے علاوہ اور کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

گاندھی جی سے گزارش

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے یورپ میں "شاہی حقوق" پر بہت زور سے بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت گاندھی جی نے اپنے ایک مضمون میں ایک بہت اچھی بات کہی تھی کہ "یورپ والے اگر دنیا میں امن کے خواہاں ہیں تو انہیں اپنے حقوق پر بحث کرنے کے

بجائے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ان کا اعلان کرنا چاہئے"

میں گاندھی جی سے کہتا ہوں کہ وہ دنیا کی ہر تہذیب سے یہ توقع چھوڑ دیں۔ یہ بات تو صرف اسلام میں ہے۔ جو اپنی رعایا سے اپنے شاہی حقوق منوانے کے بجائے خود اپنی خادمانہ ذمہ داریوں کا اعلان کرتا ہے۔

سیاسیات میں مسلمانوں کی بے عملی

لیکن پھر وہی بات کہنی پڑتی ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ طرز عمل کو دیکھ کر کیسے اس بات کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسلام "خدمت انسانیت" کا پروگرام اور خالص خدا پرستی کا دستور ہے، ——— کیونکہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر یہ بات ہوتی تو جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہے ہیں۔ بلکہ اسلام کا نعرہ لگاتے لگاتے ان کے گلے خشک ہوئے جا رہے ہیں۔ وہ موجودہ جنگ آزادی کی تحریک میں اس قدر پیچھے نہ ہوتے، ان کو تو یہ چاہئے تھا کہ نہ صرف اپنی قوم کے لئے بلکہ تمام ہندوستانی قوموں کی خوشحالی طور رفاہیت کے لئے انگریزی طاقت کے خلاف جنگ کرتے کہ اس طاقت کی موجودگی نے قوموں کی خوشحالی اور تہذیب و اخلاق کو زبردست نقصان پہنچایا ہے ———

ایک انصاف پسند مسلمان کو اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر کوئی

چارہ نہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ روش پر ندامت محسوس کرنے کے بجائے انشا فخر کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہمارے لیڈروں نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ہمیں وہ سیاسی حقوق دلوا دیئے جو دوسری قوموں نے بڑی بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کئے ہیں"۔

بغیر قربانی کی آزادی

لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ بغیر قربانی کے بھی قوموں کو آزادی نصیب ہوتی ہے؟

ہاں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے جو آزادی ملی تھی اس میں بنی اسرائیل کی اپنی جدوجہد کو کوئی دخل نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی پیغمبرانہ قوت اور قاہرانہ معجزات سے آزاد کرایا۔

فرعون بحرِ قلزم میں غرق ہوگیا۔ اور بنی اسرائیل کے لئے اس میں خشک راستے بن گئے، اور یہ نجات پا گئے، لیکن جو قوم اپنی جدوجہد کے بغیر آزاد ہوتی ہے وہ آزادی کی نعمت سے فائدہ نہیں اٹھاتی، کیوں کہ اس کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، چنانچہ فرعونی حکومت سے آزادی کے بعد جب حق تعالیٰ نے آزاد بنی اسرائیل کے لئے ایک آئین نازل فرمایا یعنی توراۃ تاکہ بنی اسرائیل آزادی کی فضاء میں ترقی کرکے اپنی پچھلی عظمت حاصل کریں، تو بنی اسرائیل نے اس آئین

کو تسلیم کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً (بقرہ) — ہم ہرگز تیری تصدیق نہ کریں گے کہ یہ آئین کہ طور پر تجھے خدا تعالیٰ نے دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم خود خدا تعالیٰ کو عیاناً نہ دیکھ لیں۔

ایک طرح سے نہیں سینکڑوں طرح سے خدا کے نمائندے حضرت موسیٰؑ کو تنگ کیا۔ بالآخر جب حضرت موسیٰؑ نے ارشاد فرمایا۔ اچھا۔ اب تمہیں اپنے قومی وطن فلسطین کو عمالقہ سے آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ فرعون سے آزاد کرا کر تو میں تمہیں یہاں تک لے آیا۔ آگے اس کام کے لئے تم قربانی دو۔

بنی اسرائیل ——— عیش پرست بنی اسرائیل ——— بے عمل بنی اسرائیل بھلا اس عظیم الشان قربانی کے لئے کیسے تیار ہو سکتے تھے۔ صاف انکار کر دیا اور خدا کے رسول سے کہا ——— مائدہ ؎ میں فرماتے ہیں۔

اِذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ — اے رسول، تم اور تمہارا رب اس کام کے لئے جاؤ اور دشمنوں سے قتال کرو، ہم لوگ اسی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔

تب حضرت موسیٰؑ نے مایوس ہو کر اپنے خدا سے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ — موسیٰ نے کہا۔ اے میرے رب! میرے اختیار میں تو صرف میری اور میرے بھائی کی جان ہے۔

الْفَاسِقِيْنَ۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِيْنَ۔

سو تو ہمارے اور ہماری فاسق قوم کے درمیان فیصلہ کردے۔ فرمایا ہم نے اس قوم پہ چالیس سال تک فلسطین میں داخلہ حرام کردیا ہے یہ اسی سرزمین پہ سرگرداں پھرتے رہیں گے سو تو نافرمان قوم پہ افسوس نہ کر۔

( )

خدا کے فیصلے کے مطابق "میدانِ تیہ" میں بنی اسرائیل چالیس سال تک بھٹکتے رہے اور اپنی بے عملی کی پاداش میں اسی صحرا میں ہلاک ہوگئے —— ان کے بعد نئی نسلیں آئیں اور انہوں نے حضرت یوشعؑ کی قیادت میں فلسطین کو آزاد کرایا۔

یہ حشر ہوا اس قوم کا جو بغیر اپنے عمل و قربانی کے آزاد ہوئی تھی کہ اس نعمت کو سنبھال نہ سکی —— اور آزادی کی ذمہ داریاں اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن کر رہ گئیں۔

قربانی سے حاصل کی ہوئی آزادی

دوسری قسم کی آزادی وہ ہے جو کسی قوم کو اپنی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت نے قریش کے جبر و استبداد سے جو نجات پائی اس میں ان کی بے پناہ قربانیوں کو دخل تھا، اور ان کی آزادی اسی دوسری قسم کی آزادی تھی۔

پھر کیا ہوا ؟ —— مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ نہ صرف کسی ایک قوم کے مقابلہ میں بلکہ روئے زمین کی طاغوتی طاقتوں کے مقابلہ میں جہاد شروع کر دیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ (انفال)

اے مسلمانو! جب تم میدان جنگ میں کفار کے مقابلہ میں آؤ تو ان سے پیٹھ پھیر کر نہ بھاگنا۔

صحابہ کرام نے اپنے نبی کی آواز پر لبیک کہا اور فرمایا ——

"خدا کی قسم اگر آپ سمندر کی موجوں میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو اس میں کود پڑیں گے۔ اور ایک شخص بھی ہم میں سے پیچھے نہیں رہے گا۔ امید ہے کہ آپ کو خدا تعالیٰ ہماری طرف سے وہ چیز دکھلائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ ہم اپنے پیغمبر کے ساتھ ہو کر اس کے داہنے اور بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرف سے جہاد کریں گے، خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں۔ جنہوں نے موسیٰ سے کہہ دیا تھا۔ "تو اور تیرا رب جائے ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں" ——

صحابہ ہمت و عزم کے ایک تھے، اور شجاعانہ کردار ان کا قابل فخر امتیاز تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جتنی مدت بے عمل اور بزدل بنی اسرائیل فتوحات

سے محروم ہوکر "وادی تیہ" میں بھٹکتے رہے اس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں نے مشرق و مغرب میں ہدایت کا پرچم لہرا دیا۔

اب مسلمان سوچیں وہ کس قسم کی آزادی چاہتے ہیں۔ اقبال نے کہا ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

ہر ایک مقام سے آگے گذر گیا مہ نو
کمال کسی کو پیدا ہوا ہے بے تگ ودو
نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

منبر پر آخری خطبہ

انصار کی فضیلت

منبر پر آپ کا آخری خطبہ وہ تھا جس میں آپ نے کھڑکیاں بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ سوائے ابوبکرؓ کی کھڑکی کے اور اس میں انصار کی فضیلت بیان فرمائی تھی۔

نیز حضرت اسامہ ابن زید رضؓ کی قیادت پر جو اعتراضات کئے گئے تھے۔ ان کا جواب بھی آپ نے اسی آخری مجلس میں دیا تھا۔

فضیلت انصار کے بارے میں جو جملے جناب نے ارشاد فرمائے تھے۔ وہ امام بخاری کی حسب ذیل روایت میں اس طرح پائے جاتے ہیں۔

ایک روز حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عباس رضؓ انصار کی ایک مجلس سے گزرے دیکھا کہ انصار بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا بیماری کے ایام میں ایک روز حضور مسجد میں تشریف لائے۔ چادر کا کنارہ آپ کے سر پر بندھا ہوا تھا۔ ممبر پر رونق افروز ہوئے اور ممبر پر وہ آپ کی آخری جلوہ گری تھی کہ اس کے بعد پھر کبھی اس جگہ پر آپ کو دیکھنا نصیب نہ ہوا ——— آپ نے خدا خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا فرمائی اور پھر کہا۔

أوصيكم بالأنصار فإنهم كرشي وعيبتي وقد قضوا الذي عليهم وبقي الذي لهم فاقبلوا من محسنهم وتجاوزوا عن مسيئهم	مسلمانو! میں تمہیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں یہ لوگ میری قابل اعتماد اور رازدار جماعت ہے انہوں نے مجھ سے جو وعدہ نصرت کیا تھا وہ پورا کر دیا میں نے جو ان سے وعدہ کیا تھا وہ باقی ہے ان کے نیکوں کی نیکیاں قبول کرنا ان کی لغزشوں سے درگزر کرنا۔

ابن عباس کی روایت میں یہ الفاظ اور ہیں۔

فان الناس یکثرون ویقلون الانصار حتی یکونوا کالملح فی الطعام فمن ولی منکم امراً یضر فیہ احداً او ینفعہ فلیقبل الخ

لوگ بڑھتے جائیں گے مگر انصار کی تعداد کم ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ آٹے میں نمک کی مانند ہو جائے گی پس جو شخص تم میں سے مسلمانوں کے امر کا والی بنے۔ مسلمانوں کے کام کو نقصان پہنچائے یا فائدہ ——— تو اسے ان کی نیکیاں قبول کرنی چاہئیں۔ اور الخ

علامہ زرقانی نے اس خطبہ کے متعلق جو روایت نقل کی ہے اس میں، یہ بھی ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا ——— "لوگو! میں نے سنا ہے کہ تم میری وفات سے ڈرتے ہو۔ کیا انبیاء سابقین میں سے کوئی پیغمبر باقی رہا ——— ؟ ——— میں بھی خدا سے ملنے والا ہوں اور تم بھی ——— مہاجرین اولین کے ساتھ بھلائی کرنا اور وہ لوگ بھی آپس میں بھلائی کریں اس کے بعد سورہ عصر کی تلاوت فرمائی ——— اور کہا ——— سارا کام خدا کے حکم پر چلتا ہے۔ جس کام میں تاخیر ہو اس میں عجلت نہ کرو یاد رکھو کسی انسان کی عجلت سے خدا تعالیٰ جلدی نہیں کرتا۔"

میں تمہیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ انہوں نے تم سے پہلے مدینہ کو اپنا وطن بنایا یعنی مدینہ ان کا اصلی وطن ہے اور ایمان کو اپنے اوپر لازم کرلیا۔ کیا ان لوگوں نے اپنے پہلوں میں

تمہیں اپنا شریک نہ بنایا۔ کیا انھوں نے اپنے مکانوں میں تمہیں جگہ نہ دی۔ کیا انھوں نے باوجود اپنی تنگ دستی کے تمہیں اپنی جانوں پر ترجیح نہ دی۔ دیکھو۔ تم بھی انہیں اپنے نفسوں پر ترجیح دینا۔

میں تم سے پہلے جاتا ہوں۔ تم بھی مجھ سے ملو گے۔ میرا تمہارا حوض پر ملنے کا وعدہ ہے۔"

یہ خطبہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کے روز بعد نماز ظہر دیا تھا۔

انصار کی بے مثال قربانیاں

مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سروسامان نکلے تھے۔ گو ان میں دولت مند بھی تھے مگر کفار مکہ کے ظلم و استبداد نے نہ انہیں اپنا مال ساتھ لانے دیا تھا نہ اپنا سامان ——— ایسی حالت میں وطن سے بے وطن ہونا کچھ آسان کام نہیں۔ اگر مسلمانانِ مدینہ اپنے ان بھائیوں کے ساتھ اپنی بے مثال ہمدردی اور ایثار کا ثبوت نہ دیتے اور آپس میں حقیقی بھائیوں کی طرح انہیں اپنے مال۔ اپنے گھر۔ اپنی تجارت اپنے باغات اور اپنی زمینوں میں شریک بنا کر نہ رکھتے تو آپ ہی بتایئے کہ مسلمانانِ مکہ کا ہجرت پر قائم رہنا بظاہر کس قدر مشکل تھا———

یہ وہ تاریخی ایثار تھا۔ جس پر انسانی دنیا جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

ایثار کا ایک واقعہ

ایک روز حضور اکرم صلعم کے پاس ایک صاحب آئے۔ عرض کیا۔ حضورؐ! بھوک سے بے تاب ہوں۔ فرمایا۔ ازواج مطہرات کے پاس جاؤ۔ وہ تمہاری امداد کریں گی ـــــ ہے آپ کے دروازے سے کبھی سائل خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ اور ہمیشہ آپ ہی غریبوں کی امداد کرنے میں سبقت فرمایا کرتے تھے ـــــ اِلّا یہ کہ دونوں جہان کا سردار اور اس کے گھر والے فاقہ کی حالت میں ہوں اور مجبور ہو کر آپ سائل کو کسی اور کے پاس بھیج دیں۔ ـــــ سائل حضور کی اہل بیت کے پاس گیا۔ جواب ملا۔ سوائے پانی کے رسول کے گھر میں کچھ نہیں پھر آپ نے صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا ـــــ کون اس مہمان کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے ـــــ مسلم کی روایت کے مطابق حضرت ابو طلحہ رضؓ اٹھے اور اپنے ساتھ لے گئے۔

بیوی سے جا کر کہا۔ یہ رسول اللہ کا مہمان ہے اس کی خوب تواضع کرنا۔ بیوی بولیں۔ گھر میں رکھا کیا ہے۔ سوائے چند لقموں کے جو بچوں کے لئے رکھ دیئے ہیں۔ تاکہ وہ کھا کر سو رہیں۔ ابو طلحہ بولے کوئی بات نہیں۔ جو کچھ ہے لے آؤ۔ چراغ گل کر دو اور بچوں کو سُلا دو۔

——— نیک شوہر کی نیک بیوی اٹھی اور چراغ کے قریب جاکر اس طرح کھڑی ہوگئی، گویا کہ اس کی بتی اونچی کر رہی ہے۔ اور اس طرح سے اس چراغ کو بجھا دیا۔

ابو طلحہ اور مہمان رسول اللہ دونوں دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ مہمان کھانا کھاتا رہا اور ابو طلحہ خالی منہ چلاتے رہے۔

مہمان کو اگر معلوم ہو جاتا کہ کھانا کم ہے تو یقیناً وہ تنہا کبھی نہ کھاتے اس لئے انہیں محسوس ہی نہ ہونے دیا ——— مہمان کا پیٹ بھر گیا اور دونوں میاں بیوی مع بچوں کے بھوکے سو گئے ———

واقعہ ایسا نہ تھا جس سے آسمان والے حیرت میں نہ رہ جاتے ——— ہر فرشتہ کی زبان پر ابن آدم کی اس نیکی کا چرچا ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اس واقعہ پر بجا طور پر فخر کیا ہوگا کہ یہ وہی ابن آدم ہے جس کے دم کے لئے چاند۔ سورج۔ تارے۔ ہوائیں۔ زمین و آسمان اور کل کائنات پیدا کی گئی ہے ———

چنانچہ جب صبح کو ابو طلحہ رض حضور ؐ کے دربار میں پہنچے تو آپ نے انتہائی خوشی کے ساتھ ابو طلحہ رض کو یہ خوشخبری سنائی۔ ابو طلحہ! رات والے واقعہ سے خدا تعالیٰ بڑا راضی ہوا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں ———

فضحك الله الليلة ـــــــ ؟ ـــــ عجب من فعا لكما؟ ـــــ

اور یہ آیت نازل فرمائی۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ	یہ لوگ دوسروں کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں
لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ	اگرچہ خود کیسی ہی بھوک وپیاس میں مبتلا ہوں
مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ	جو شخص نفس کے بخل سے بچا دیا گیا۔ وہی
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (صحیحین)	لوگ ہیں کامیاب

حضرت اسامہؓ کی قیادت

اس آخری خطبہ میں حضرت اسامہ رضؓ ابن زید رضؓ کی قیادت جیش پر ناک بھوں چڑھانے والوں کو جو سرزنش حضورؐ نے فرمائی وہ دین کے ایک اہم باب سے تعلق رکھتی ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کچھ کہا جائے۔ ـــــ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری سے چند روز پہلے حضرت اسامہ رضؓ کی قیادت میں ایک جیش ترتیب دیا۔ اور ان سے فرمایا۔ میں نے تمہیں اس لشکر کا امیر مقرر کیا۔ تم فلسطین جاؤ۔ اور رومیوں پر حملہ کرو ـــــــ جانے میں جلدی کرنا تاکہ انہیں تمہاری روانگی کی خبر نہ ہو۔

وجہ اس لشکر کے ترتیب دینے اور رومیوں پر حملہ کرنے کی یہ تھی کہ سریہ موتہ میں زید ابن حارثہ رض، عبداللہ ابن رواحہ رض اور جعفر ابن ابی طالب رض رومیوں کے ہاتھ سے مظلومانہ طور پر شہید ہوئے تھے ـــــ اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو قتل کر دیا گیا ـــــ

حالانکہ قاصد کو قتل کرنا کسی وقت بھی اچھا نہیں سمجھا گیا۔ اور جب حضور نے اپنے قاصد کے خون کا بدلہ لینے اور اس قسم کے بین الاقوامی مجرموں کو سزا دینے کے لئے حضرت زید کی قیادت میں مجاہدین روانہ کئے تو انہیں بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ـــــ

یہ لشکر سریہ موتہ کے انتقام ہی کے لئے آپ نے ترتیب دیا تھا جس کی سرداری کا شرف حضرت اسامہ کو حاصل ہوا۔

اس وقت حضرت اسامہ رض کی عمر ۱۸ یا ۲۰ برس کی تھی ـ اور فوج میں تمام اکابر مہاجرین موجود تھے ـ بعض صحابہ نے اسامہ رض کی قیادت پر اعتراض کیا ـ حضرت عمر رض نے بہت سمجھایا مگر جب بات بڑھ گئی تو آپ نے حضور ص کو مطلع کیا ـــــ حضور ص بیماری کی حالت میں مسجد میں تشریف لائے کیونکہ آپ کو بڑا صدمہ ہوا تھا جب آپ نے یہ خبر سنی تھی کہ اسامہ رض کی سرداری پر لوگ

معترض ہیں۔ ——— خطبہ دیا۔ اور فرمایا ———

لوگو! مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ اسامہ کی قیادت پر نکتہ چینی کر رہے ہو۔ اگر اسامہ رضؓ کی کم عمر ہے تو یہ بتاؤ کہ تم اس سے پہلے اس کے باپ زید کی قیادت پر کیوں اعتراض کر چکے ہو ———
خدا کی قسم اس کا باپ بھی قیادت کا اہل تھا۔ اور اس کا بیٹا بھی اس کا اہل ہے۔ زید بھی مجھے محبوب تھا۔ اور اسامہ بھی مجھے محبوب ہے۔
نسب پر فخر کرنا جاہلیت ہے ———

اعتراض کرنے والے بظاہر حضرت اسامہ رضؓ کی کم سنی کو آڑ بنا رہے تھے۔ مگر حضورؐ اصل حقیقت کو سمجھ چکے تھے کہ یہ لوگ ایک غلام زادہ کی قیادت پر چیں بجبیں ہیں۔ ——— چنانچہ حضورؐ نے اس کی جانب اشارہ فرمایا۔ "اگر اسامہ رضؓ کی عمر کم ہے تو زید رضؓ کم عمر نہیں تھا۔ پھر اس پر کیوں معترض ہوئے تھے؟"

نسب پر فخر و غرور جاہلیت کی وہ لعنت ہے جس کی اسلام نے نہایت شدت سے مخالفت کی ہے۔ تئیس سال کی تربیت کے بعد صحابہ میں نسب پرستی کا یہ اثر محسوس کر کے حضورؐ کا رنجیدہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ آپ نہایت غضبناک لہجے میں صحابہ کرام سے مخاطب ہوئے اور یہی مسئلہ اس آخری خطبہ کا اصل محرک بنا۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی میں حضرت اسامہ رض کا انتخاب کیوں فرمایا تھا ——؟ —— اول تو ان کے والد غزوہ موتہ میں شہید کئے گئے تھے۔ اس وجہ سے مقابلہ میں جو جوش و خروش یہ دکھا سکتے تھے وہ دوسرے سے مشکل تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ نے آخری مرتبہ پھر اس بات کا اعلان کرنا ضروری سمجھا کہ قیادت اور امامت نسب یا حسب پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اس میں تقویٰ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے —— تقوی ہی تمام قابلیتوں کی ضمانت ہے۔ اور اسی پر اصل سرداری اور شرافت کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

قبر پرستی کی ممانعت

صحیحین میں حضرت عائشہ رض سے ایک روایت منقول ہے۔ فرماتی ہیں۔ —— "بیماری کے ایام میں ایک روز ایک زوجہ مطہرہ نے حبش کے عبادت خانوں کی تعریف میں چند جملے کہے —— انہوں نے صاف تو نہ کہا مگر ان کا اشارہ اسی طرف تھا کہ اگر حضور ارشاد فرمائیں تو ہم بھی آپ کی قبر پر اسی قسم کا

شاندار مقبرہ تعمیر کرادیں)۔

آپ نے تکیہ سے سر اٹھایا اور فرمایا ——— "نصاریٰ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ (مسجد) تعمیر کر لیا کرتے تھے۔ اور اس میں بزرگوں کی تصویریں آویزاں کی جاتی تھیں ——— یہ لوگ خدا کی بدترین مخلوق ہیں۔

خبردار! میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو" انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مسجد قرار دے لیا ہے۔

ملا علی قاری کی تشریح

یہود و نصاریٰ نے قبور انبیاء کو مساجد قرار دے لیا ہے۔ اس وجہ سے ان پر پھٹکار رہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔؟

ملا علی قاری فرماتے ہیں ———

یہود و نصاریٰ پر لعنت کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو تعظیماً سجدہ کرتے ہیں۔ جو شرک جلی ہے۔ یا اس وجہ سے کہ یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی قبروں کی طرف توجہ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ جو شرک خفی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کی تشریح

علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "کتاب الوسیلہ" میں اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"کسی جگہ کو مسجد قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ پنجگانہ نمازوں اور دوسری عبادتوں کے لئے اسے مخصوص کر لیا جائے۔ جیسے کہ مسجدیں مخصوص ہوتی ہیں۔ کہ جن میں صرف خدا تعالیٰ کی عبادت اور اسی سے دعا ہوتی ہے۔ نہ کسی مخلوق سے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرے سے قبروں کو مسجد قرار دینا یعنی وہاں نماز پڑھنے کے لئے اس طرح جانا جس طرح مسجدوں میں جاتے ہیں۔ قطعاً حرام کر دیا ہے۔ اگرچہ جانے والوں کی نیت خدائے واحد کی عبادت ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ اس لئے کہ مبادا لوگ ایسی جگہوں میں محض صاحب قبر کی عقیدت، اس سے دعا مانگنے اور منگوانے یا قبر کو متبرک جان کر اس کے پاس اللہ سے دعاء مانگنے کو افضل سمجھ کر آنا جانا شروع کر دیں۔ لہٰذا آپ نے ایسی جگہوں کو اللہ واحد کی عبادت کے لئے کام میں لانے ہی سے روک دیا۔

کیونکہ شریعت کا عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی فعل موجب فساد ومضرت ہو اور کوئی عظیم الشان مصلحت نہ رکھتا ہو۔ تو اس سے

منع کر دیا جائے۔

مثلاً طلوع آفتاب۔ غروب آفتاب اور نصف النہار تینوں اوقات میں شریعت نے نماز سے روک دیا۔ کیونکہ اس میں مشرکین سے مشابہت تھی۔ اور اس بات کا قوی احتمال تھا کہ یہ عمل کسی وقت بھی شرک کا موجب ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس میں کوئی خاص مصلحت نہ تھی۔ جس کی رعایت کی جاتی۔ کیونکہ دوسرے اوقات میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ (کتاب الوسیلہ صہ ۳۲)

علامہ ابن حجر کی رائے

علامہ ابن حجر فتح الباری میں اس حدیث کے ماتحت لکھتے ہیں۔

"یہ لعنت اس تقدیر پر ہے کہ قبروں کی طرف نماز ادا کرے بنا بر تعظیم کے۔ یہ بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام اور صلحاء امت کی قبروں کے جوار میں مسجد بنانا محض حصول فیض کی نیت سے (نہ بقصد تعظیم قبر اور نہ بقصد توجہ جانب قبر) تاکہ صاحب قبر کے قرب کی برکت سے نماز کا ثواب زیادہ حاصل ہو کچھ مضائقہ نہیں رکھتا۔

ابن تیمیہ اور ابن حجر کی رائے میں تطبیق

بظاہر علامہ ابن تیمیہ اور ابن حجر کی تشریحات میں تضاد و تصادم

ہو رہا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ابن تیمیہ نے جن خطرات کی وجہ سے "مقابر کو عبادت الٰہی تک کے لئے خاص کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ان کے پیش نظر ایک پرفتن زمانہ ہیں علامہ کی رائے سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ابن حجر نے قطع نظر حالات کے مسئلہ کی اصل صورت پر روشنی ڈالی ہے ـــــ موجودہ حالات جو امت مسلمہ کے اخلاقی و مذہبی انحطاط کا بدترین نمونہ ہیں۔ کسی طرح بھی اجازت نہیں دیتے کہ مسلمانوں کو اس جواز پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے۔

آج قبروں کے سامنے سجدے ہوتے ہیں۔ اصحاب قبور سے روزی اور اولاد مانگی جاتی ہے۔ قبروں کا طواف کیا جاتا ہے قبروں کے پاس مراقبے ہوتے ہیں۔ میلے اور ناچ گانے ہوتے ہیں ـــــ اور ان تمام خرافات کو اسلام کی سند کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے ـــــ کیا ان تمام مشرکانہ اعمال کے لئے بھی اسلام کے پاس سند جواز ہے ـــــ؟ ہزار بار توبہ کیجئے کہاں دین حنیف اور کہاں یہ اعمال شرک ـــــ

پھر بتایئے کہ کیسے اس جواز کی تبلیغ کی جا سکتی ہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ ابتداء اسلام میں عرصہ دراز تک حضورؐ نے

مسلمانوں کو قبرستان جانے تک سے روکے رکھا —— جب مدت کے بعد اجازت دی تو فرمایا —— میں نے اس لئے روکے رکھا تھا۔ کہ کہیں تم بت پرستی سے قبر پرستی کی طرف مائل نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ تم تازہ تازہ بت پرستی سے تائب ہو کر آئے تھے ——

آج مسلمان توحید پرستی سے اتنے ہی نا آشنا ہو چکے ہیں جتنا کہ ایک مشرک قوم ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں زیارت قبور کے باب میں جتنی بھی سختی کی جائے کم ہے —— رہے خواص اور وہ لوگ جو اعتدال سے تجاوز نہیں کر سکتے تو انہیں جواز پر عمل کرنے کی اجازت ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ لوگ احتیاط کو ملحوظ رکھیں اور ان کا طرزِ عمل عوام الناس کی گمراہی کا موجب نہ بنے۔

امت کو خوشخبری

رویائے صادقہ ——

مسلمان صبح کی نماز میں مشغول تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی امامت کر رہے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ بات بے حد خوشی کی تھی کہ میرے بعد امت کا شیرازہ منتشر نہ ہوگا۔ اور امت

ابوبکرؓ کے ماتحت منظم رہے گی۔ چنانچہ آپ نے پردہ اٹھاکر امت کو دیکھا۔ اور اس حالت پر ــــــ امت کو خوشخبری سناتے ہوئے فرمایا ــــــ لوگو! اب انبیاء علیہم السلام کی لبشارتوں یعنی وحی میں سے کچھ باقی نہیں رہا ــــــ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد وحی کا آنا بند ہو جائے گا ــــــ سوائے رویائے صادقہ کے۔ جو ایک مسلمان اپنے متعلق خود دیکھے یا اس کے متعلق کوئی دوسرا مسلمان دیکھے (مسلم عن عبداللہ ابن عباس)

مکالمہ الٰہی

اس حدیث کی تشریح سے پہلے اتنی بات سمجھ لیجیے۔ کہ جس طرح علم کے مادی ذرائع تین ہیں۔ وجدان حسِ ظاہر۔ بدیہیات۔ اسی طرح علم حاصل کرنے کے روحانی ذریعہ کا نام "مکالمہ الٰہی" ہے۔

یہ اصطلاح قرآن کریم کی ہے ــــــ سورۂ شوریٰ میں فرمایا گیا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۤئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا	کسی بشر کی یہ طاقت نہیں کہ وہ خداتعالیٰ سے کلام کرے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا وہ کسی قاصد کو بھیجے سو وہ قاصد خدا

يُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۔ کے حکم کے مطابق اس پر وحی کر دے بیشک اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۔ خدا تعالیٰ بلند اور حکمت والا ہے،

انہی تین طریقوں کو علمی اصطلاحات میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے ——

مکالمہ الٰہی کے تین طریقے

دل میں کسی مفہوم کا آنا۔ بغیر آواز اور بغیر الفاظ کے اگر حالتِ بیداری میں ہے تو "کشف" ہے۔ اور اگر حالتِ خواب میں ہے تو "رویا" ہے۔

پردہ کے پیچھے سے بات کرنا۔ یعنی متکلم نظر نہیں آتا۔ مگر غیب سے آواز آتی ہے۔ اور الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ اس کو "الہام" کہتے ہیں۔

فرشتہ کے ذریعہ بات کرنا۔ یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے آتا ہے۔ اور وہ اپنے منہ سے کلام الٰہی کے الفاظ ادا کرتا ہے۔ جسے نبی محفوظ کر لیتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں —— گو لغت کے اعتبار سے ان سب صورتوں پر بھی "وحی" کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ——

اس تفصیل کے بعد اب آپ اصل بات سمجھئے کہ نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے خیال سے صحابہ کرام رضؓ قدرتی طور پر غمگین ہوئے ہوں گے۔ اس بناء پر کہ آپ کے بعد انسانوں اور خدا کے درمیان تخاطب و کلام کا علاقہ باقی نہیں رہے گا۔ حالانکہ یہ خدا تعالیٰ کی وہ عظیم نعمت ہے جو انسان کو ہر گمراہی سے بچاتی اور اس کی رضامندی پر چلاتی ہے ــــــــ

صحابہ رضؓ کے اس غم کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح احساس تھا۔ اس لئے آپ نے صحابہ کرام کو مطمئن کرنے کی غرض سے ایک خوشخبری سنائی جس سے ایک غلط فہمی بھی دور ہو گئی اور حقیقت حال بھی سامنے آگئی ــــــــ "یعنی لوگو! کلام الٰہی کا یقینی اور معصوم سلسلہ جو حضرت انبیاء علیہم السلام پر آتا ہے۔ میری ذات پر ختم ہو چکا ہے۔ اور میرے بعد اس کا آنا نا ممکن ہو گیا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اپنے کلام سے بالکل محروم کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے پاک روحوں پر "رویائے صادقہ" کا نزول ہوتا رہے گا۔ یہ رویا نبوت کے چھیالیس ۴۶ حصوں میں سے ایک حصہ ہے ــــــــ یہ آخری الفاظ بخاری کے ہیں۔ جن سے رویائے صادقہ کی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے ــــــــ

اس موقعہ پر سچے خوابوں کا ایک معیار بھی پیش نظر رکھئے تاکہ

"حُلم" یعنی پریشان خیالات اور "رؤیا" میں امتیاز ہو جائے۔

سچے خواب کون دیکھتا ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اَصْدَقُکُمْ رُؤْیَا اَصْدَقُکُمْ حَدِیْثاً (مسلم) تم میں سب سے زیادہ سچا خواب دیکھنے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ سچ بولتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہے جس کی زبان سچ بولے گی۔ اس کی روح بھی سچ دیکھے گی۔ اور جو زبان کا جھوٹا ہو گا۔ اس کا قلب بھی اس نعمت سے محروم رہے گا۔

یہ حدیث در اصل سورۂ یونس کی آیت ذیل کی تفسیر ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ، لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ، لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

جو لوگ ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے اس دنیا میں خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا کے کلمات میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام نے پوچھا۔ حضورؐ! اس دنیا میں بشارت کیا ہے ———؟ فرمایا۔ وہ سچے خواب ہیں

جو ایک مسلمان دیکھتا ہے۔ (مسلم) ——— مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و تقویٰ اختیار کر کے اپنے دعوے ایمان کی سچائی کا ثبوت پیش کر دیتے ہیں۔ انہی سے خدا تعالیٰ "سچے خوابوں کے ذریعہ کلام فرماتا ہے۔

اس آیت اور حدیث بالا کی روشنی میں اب ہم صاف طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان و تقویٰ کی مخالفت کرنے والے۔ اور "صدق قول" کے خلاف زندگی گزارنے والے نہ تو سچے خوابوں کے اہل ہوتے ہیں۔ اور نہ ولی اور قطب ہی بن سکتے ہیں

خوابوں کی اصل حیثیت

پھر یہ بات بھی نہ بھولئے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب تو وحی الٰہی ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ خدا کی مرضی کے لئے سند بن سکتے ہیں مگر پیغمبروں کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی ایسا نہیں جس کے خواب یا الہام و کشف کو سند کا درجہ حاصل ہو کہ اسے خدا کے دین کے مقابلہ میں قابلِ اتباع قرار دیا جائے۔

بالکل آخری وصیت

نماز کی اہمیت

حضرت ام سلمہ رضہ بیان فرماتی ہیں ——— "وفات

کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت یہ تھی کہ
الصلوۃ الصلوۃ وما ملکت ایمانکم حتی جعل یلجلج فی صدرہ وما یفیض بھا لسانہ نماز قائم رکھنا۔ نماز قائم رکھنا۔ اور غلاموں اور لونڈیوں کے حقوق کی حفاظت کرنا۔ یہی فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ کی آواز گھبرا گئی اور زبان اس کے ادا کرنے سے قاصر ہو گئی۔

حضرت انس کی روایت میں ہے۔ حتی یتغرغر فی صدرہ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت کو سمجھنے اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے اول تو یہی بات کافی ہے کہ یہ الفاظ رحمت اللعالمین کے منہ سے اس وقت نکل رہے تھے۔ جب آپ اپنی جان جاں آفریں کے سپرد فرما رہے تھے۔

لیکن بہتر ہوگا کہ ہم نماز کی دینی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈال لیں تاکہ یہ بات بخوبی واضح ہو جائے کہ نماز واقعی ایسی عبادت ہے۔ جس کے لئے وہ تاکید ضروری تھی جو آپ نے اختیار فرمائی۔

توحید اور نماز کا باہمی تعلق

قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی مستند تاریخ ہے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے۔ کہ دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا۔ جس نے توحید کے ساتھ ساتھ نماز کی تعلیم نہ دی ہو ——— کیونکہ اگر

توحید ہمارے تصورات کی بنیاد ہے۔ تو نماز ہمارے اعمال خیر کا اصل محرک ہے ـــــ اس لئے ضروری تھا کہ نماز ہر آسمانی مذہب کی تعلیم میں موجود ہوتی ـــــ

توحید گو مذاہب آسمانی کی اساس ہے مگر اس کی تکمیل کا دور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسی دور سے نماز بھی اپنے تمام خط و خال کے ساتھ نمایاں ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہی ہو سکتا ہے کہ توحید اور نماز میں علم و عمل کا تعلق ہے۔ توحید ایمان ہے اور نماز اس کا عملی مظاہرہ۔ جب توحید کا ارتقاء ہوا تو نماز بھی ساتھ ساتھ تکمیل پذیر ہونی شروع ہو گئی ـــــ

یہاں تک کہ جب تعلیم محمدیؐ نے توحید کی تکمیل کو اس کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ کیونکہ اب انسان کی عقلی نشوونما اس درجہ پر پہنچ چکی تھی۔ تو نماز بھی اپنی آخری صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دی گئی ـــــ

انبیائے سابقین اور نماز

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہوئے اس کی وجہ بیان

فرماتے ہیں۔

رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ (ابراھیم) اے پروردگار تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

یہی ابراہیم اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي (ابراہیم) اے رب مجھے اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز قائم کرنے والا بنا دے۔

حضرت لوط۔ حضرت اسحاق۔ حضرت یعقوب۔ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کو حکم دیا گیا تھا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ (انبیا) اور ہم نے ان پیغمبروں پر وحی نازل کی نیک کاموں کی اور نماز قائم رکھنے کی۔

اسلام اور نماز

اب اسلام کو دیکھئے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی مسلمان جب تک اس میں ہوش وحواس باقی ہیں۔ وہ نماز سے سبکدوش نہیں ہو سکتا اس میں سستی کرنے والے کو منافق کہا جاتا ہے۔ اور اس کے ترک کو کفر کی نشانی بتایا گیا ہے۔

یہ عظمت بھی عبادات اسلام میں صرف نماز ہی کو حاصل ہے کہ اس کی تکمیل معراج جیسے مقدس سفر میں ہوئی۔ اور حضورؐ نے اسے معراج المومنین فرمایا۔

اسے آپ نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا۔ اوراس کے تارک کے متعلق کہا کہ اس کا حشر ہامان۔ فرعون اور قارون کے ساتھ ہوگا۔

کلام کا طویل کرنا مقصود نہیں۔ ورنہ میں آپ کو تفصیل سے بتاتا کہ نماز نہ صرف ایمان کا ذائقہ۔ روح کی غذا۔ اوردل کی تسکین کا سامان ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی۔ تمدنی۔ اور معاشرتی اصلاحات کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔ بے شک نماز ہر قسم کی بے حیائیوں اور بری باتوں سے روکنے والی ہے۔

نماز کے اخلاقی اور سیاسی فائدے

اجمالاً سن لیجئے ـــــ نماز انسان کو ستر پوشی کا سبق دیتی ہے کہ یہ شرم وحیاء کی نگہداشت کے لئے ضروری ہے۔ نماز پاکیزگی سکھاتی ہے۔ اور پاک رہنے کا عادی بنا دیتی ہے۔ جو فطرت سلیم کا پہلا سبق ہے۔ نہ صرف جسم کی پاکیزگی بلکہ کپڑوں کی صفائی اور پاکیزگی بھی ـــــ نماز انسان میں اوقات کی پابندی کا جذبہ پیدا کردیتی ہے کہ زندگی کو باقاعدہ بنانے کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے۔

نماز صبح خیزی کا بھی عادی بنا دیتی ہے۔ کہ سویرے اٹھنا طب اور حفظانِ صحت کے اصول پر اشد ضروری ہے۔

نماز مسلمانوں میں محبت اور الفت پیدا کرنے کا بہترین نفسیاتی ذریعہ ہے۔

لوگ ایک جگہ بلا امتیاز جمع ہوں گے۔ اور دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں گے۔ آپس کی بے گانگی دور ہوگی۔ اتحاد پیدا ہوگا۔ اور ایک دوسرے کی مدد کے لئے مسلمان ہر وقت تیار رہیں گے۔

نماز سراسر نظم جماعت اور ڈسپلن ہے۔ سیاسی ضرورتوں اور میدانِ جنگ کے کاموں میں ایک کامیاب نمازی کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

غرضیکہ اگر نماز "نماز" کی طرح پڑھی جائے تو نماز جملہ ضرورتوں کا ایک کامیاب حل ہے ——— یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری سانسوں میں اس کی تاکید فرمائی۔

ایک یورپین لیڈی پر نماز کا اثر

آج کا دور بھی اسلام کے لئے کس قدر منحوس دور ہے کہ لوگ دعویٰ تو اسلام کا کرتے ہیں۔ مگر کسی بات کی صداقت پر یقین لانے

کے لئے نہ وہ قرآن کی تعلیم کو کافی سمجھتے ہیں۔ نہ پیغمبر اسلام کے قول کو۔ اگر آپ انہیں کوئی بات سمجھانا چاہیں تو آپ کو یورپ کے مفکرین کی رائے پیش کرنی ہوگی۔ بس یورپ کے کسی مفکر کا نام سنتے ہی ان مغرب زدہ انسانوں پر ایسا قلبی سکون نازل ہوجاتا ہے۔ گویا ان پر آسمان سے وحی آرہی ہے۔

میں نے نماز کے متعلق اوپر جو کچھ کہا ہے۔ وہ ایک "قدامت پسند" انسان کے لئے تو قابلِ توجہ ہوسکتا ہے۔ مگر روشن خیال اگر اس سے متفق ہوجائیں تو یہ ان کی توہین ہے۔ اور اس عقلیت کے دور میں حماقت ——— آج مسلمان نوجوان نماز ہی کیا پورے دین سے بے بہرہ ہوچکے ہیں۔ اور اب انہیں اپنے دین کی عبادات کے نام سے بھی شرم آنے لگی ہے ———

میں اس قسم کے مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے نماز کی حقیقت کے متعلق انگلستان کی ایک مشہور خاتون مس بیل کے ذاتی تاثرات پیش کرتا ہوں۔

یہ خاتون سیاحی اور دشت نوردی کا شوق رکھتی ہیں سیاحی بھی ممالک عربیہ کی۔ اور عربی ممالک کے ان مقامات کی جو آثار قدیمہ کیلئے مشہور ہیں۔ عربی۔ سریانی۔ یونانی۔ فرانسیسی اور بعض قدیم

زبانوں میں یہ اچھی خاصی دسترس رکھتی ہیں۔

یہ خاتون ۱۹۰۲ء میں دمشق پہنچیں۔ اور کئی ماہ تک قیام کیا وہ اپنے مکتوب میں اپنا ایک واقعہ لکھتی ہیں۔

میں اپنی قیام گاہ سے نکل کر ایک بڑی مسجد کی طرف روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر دروازہ پر ایک فقیر نے میرے جوتے اپنے قبضہ میں کئے اور میں مسجد میں داخل ہوئی۔ یہ دوپہر کے بعد کی نماز (نماز ظہر) کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کے صحن میں ہر حیثیت اور ہر درجہ کے لوگ صف باندھے کھڑے ہیں۔ دمشق کے فضلا اور ڈاکٹروں سے لے کر خستہ حال اونٹ والے اور سبزی فروش تک شانہ سے شانہ ملا کر کھڑے ہیں۔ میں صفوں کے پیچھے چند قدم کے فاصلہ پر کھڑی ہو گئی اور سنتی رہی کہ امام کیا کہتا ہے امام نے کہا۔ "اللہ بہت بڑا ہے" سب لوگ ایک اشارہ سے بیک وقت اپنے گھٹنوں پر جھک گئے۔ امام نے پھر کچھ کہا اور سب لوگوں نے اپنے چہرے زمین پر رکھ دیئے، ساری نماز میں خاموشی۔ انقیاد و اطاعت اور اپنے رب کے سامنے عاجزی قابل دید تھی۔

نماز دوسرے لوگ پڑھ رہے تھے اور اثر مجھ پہ ہو رہا تھا۔

دراصل اسلام دنیا میں بہت بڑا جمہوری مذہب ہے۔ عقیدہ کے سوا اس میں نہ نسلی امتیاز ہے۔ نہ طبقاتی انتشار۔ اور یہ روح اس کی عبادت میں پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

(خطوط مس بیل جلد اول ص ۱۹۳) بحوالہ ندائے حرم ۶۴

غلاموں کے ساتھ اچھا برتاؤ

اسلامی مساوات

اس اہم ترین وصیت کا دوسرا جزء "وما ملکت ایمانکم" ہے یعنی اپنے غلاموں اور زیردستوں کے حقوق کی حفاظت

غلاموں کے حقوق کیا میں ؟

اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے دنیا میں آنے کا بنیادی مقصد خدا کی بندگی کے ساتھ کمزوروں اور ناتوانوں کو بلند کرنا ہے۔ اسلام ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ انسان پر انسان کی آقائی قائم ہو۔ کچھ لوگ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے زندگی کی راحتوں سے یکسر محروم رہیں۔ اور کچھ لوگ بادشاہی کے تخت پر بیٹھ کر عیش پرستی کی داد دیں۔

غلامی کا انسداد

اسلام میں مساوات کی اہمیت

اگر اسلام دنیا کے ان مظلوموں کی حمایت میں آواز بلند نہ کرتا تو اس کی راہ میں اتنی مشکلات پیدا نہ ہوتیں جتنی کہ پیدا کی گئیں ـــــــ سردارانِ قریش کا یہی مطالبہ تھا کہ ان غلاموں اور کمزوروں کو اپنی مجلس سے الگ کر دو۔ ان کی موجودگی میں تو تمہارے قریب آنا بھی ہمارے لئے عار ہے ـــــــ یا ایسا کرو کہ اوقات کی تقسیم کر دو کہ جس وقت ہم آئیں یہ لوگ نہ آئیں

مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا دور رہنا برداشت کیا۔ مگر دُنیا کے ان مظلوموں کے ساتھ یہ غیر مساویانہ اور دل آزارانہ طریقہ نہ برتا۔

اسلام نے غلاموں کے آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ اور فرمایا۔ " جو ایک غلام آزاد کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اسے دوزخ کے عذاب سے آزاد کر دیتا ہے۔

غلام کے آزاد کرنے کو بہت سے گناہوں کا کفارہ قرار دیا اعلان کیا گیا کہ غلام کو " عبد " کہہ کر نہ پکارا جائے اور نہ کوئی غلام

اپنے آقا کو "سید" کہہ کر آواز دے۔ کیونکہ اصل آقا و سید خدا تعالیٰ ہے۔ اور انسان صرف اسی کا عبد و غلام ہے۔ (بخاری)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو تم کھاتے ہو۔ انہیں کھلایا کرو۔ جو تم پہنتے ہو وہی انہیں پہنایا کرو۔ ان سے زیادہ سخت کام نہ لیا کرو۔ اور اگر کوئی بھاری کام ان کے سپرد کیا کرو تو خود اس میں شریک ہو جایا کرو۔ (بخاری)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنا عمل یہ تھا کہ آپ اپنی طرز معاشرت میں وہی طریقہ اختیار کرتے تھے جو غلاموں کا تھا۔ تاکہ غلاموں سے نفرت دور ہو جائے۔ ———

اس تمام تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں غلام اور آقاؤں میں تمیز مشکل ہو گئی۔ اور صحابۂ کرام نے کثرت کے ساتھ غلام آزاد کرنے شروع کر دیئے۔

تاریخ دیکھو! اسلام نے غلاموں کو اتنی بلندی پر پہنچایا۔ اور وہ عزت بخشی کہ آج انسانی تاریخ میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔

یہی وہ تاریخی فخر ہے۔ جس پر پابندی کے ساتھ قائم رہنے

کی تاکید کی جاری ہے۔ اور اخیر وقت میں بھی اگر کوئی بات کہی جا رہی ہے تو یہ کہ ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک اور مساوات سے پیش آنا ——— کیونکہ

اگر نماز تمہاری دینی زندگی کا ستون ہے تو انصاف و مساوات تمہاری سیاسی زندگی کی جان ہے۔ نماز گئی تو تقوے گیا، مساوات ختم ہوئی۔ تو حکومت گئی۔

یہود و نصاریٰ کا جزیرۃ العرب سے اخراج

ایک اہم سیاسی اور دینی وصیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیتوں میں اس وصیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ آپ نے یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا،

اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب

یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دینا

حضرت عائشہ رضؓ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :-

لا یترك بجزیرۃ العرب دینان ——— جزیرہ عرب میں دو دین نہ چھوڑے جائیں

یعنی صرف ایک دین " دین اسلام " باقی رہے اور سب

دین ختم ہو جائیں۔

کیونکہ اگر اسلام کے مرکز میں اسلام کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے مذہب کا بھی اقتدار ہو گا۔ تو اسلام کو آئے دن اسی سے الجھنا پڑے گا۔ اور وہ مطمئن ہو کر اپنی روشنی سے عجم کو منور نہ کر سکے گا۔

اور پھر جس بستی کی بنیاد ہی خالص خدا پرستی پر قائم ہوئی ہو۔ اس میں اور اس کے آس پاس کسی ایسے فرد کو رہنے کا کیا حق پہنچ سکتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کے علاوہ دوسرے معبودوں کا بندہ ہو اور انہی کی بندگی میں رہنا پسند کرتا ہو۔

عرب سے مشرکین کا خاتمہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اہل کتاب ہی کے متعلق کیوں فرمایا کہ انہیں عرب سے نکال دینا؟ بات یہ ہے کہ بت پرستوں کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی ہی میں عرب سے ختم کر چکے تھے۔ فتح مکہ نے تمام کفار قریش کو اسلام کی قوت کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ قریش کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد وہ تمام قبائل بھی جوق در جوق اسلام میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ جو صرف اس بات کے منتظر تھے کہ قریش اور اسلام کی لڑائی میں جو فریق بھی کامیاب ہو گا۔ ہم اسی کے ساتھ ہو جائیں گے۔

بت پرستی کے اس کلی استیصال کے بعد اب یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی کہ مشرکین کو عرب سے باہر نکال دنیا۔

یہود سے رسول اللہ کا معاہدہ

رہا معاملہ یہود و نصاریٰ کا تو اس کے متعلق تاریخ نے حسب ذیل تفصیل پیش کی ہے :-

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اس وقت مدینہ میں یہود کا اقتدار تھا۔ آپ کے تشریف لاتے ہی یہود کو نظر آیا کہ اب ان کے جابرانہ اقتدار کا باقی رہنا ناممکن ہے اس لئے انہوں نے طرح طرح سے مسلمانوں کو تکلیفیں دینی شروع کر دیں۔

لیکن اس کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آتے ہی یہود سے ایک سیاسی اور مذہبی معاہدہ کیا۔ تاکہ ——

(۱) مسلمانوں اور یہودیوں کے باہمی اتحاد سے یہودیوں کو اسلام پر غیر متعصبانہ طور پر غور کرنے کا موقعہ ملے۔

(۲) مسلمان اپنے ایک دشمن یعنی کفار قریش کا یکسو ہو کر مقابلہ کریں —— جن امور پر دونوں جماعتوں کا معاہدہ ہوا انہیں ابن ہشام نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے :-

(۱) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اوران کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

(۲) یہود اور مسلمان دونوں باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

(۳) یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

(۴) کوئی فریق کفار قریش کو امان نہ دے گا۔

(۶) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا۔ لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

یہود کے ساتھ رواداری

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ یہودیوں کے ساتھ درگزر کا برتاؤ کرتے تھے۔ بلکہ آپ معاشرت کی باتوں میں اکثر یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے تھے۔ اور اس بات کی پوری کوشش فرماتے تھے کہ یہودیوں کو اس بات کا یقین رہے کہ اسلام یہود کی مذہبی توقیر مٹانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اسے دوبالا کرنا چاہتا ہے۔ بخاری میں آتا ہے۔

وکان یحب موافقۃ اهل الکتاب فیما لم یومر فیہ بشیٔ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں میں جن میں کوئی خاص حکم الٰہی نہیں ہوتا تھا۔ اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کا احترام

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک یہودی نے کسی معاملہ میں قسم کھاتے ہوئے کہا

والذی اصطفے موسیٰ علے العالمین ۔ اس ذات کی قسم جس نے موسیٰؑ کو تمام عالم والوں پر فضیلت دی ۔

ایک انصاری نے سُنکر کہا ۔

او علی محمد؟ کیا ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ؟

اس نے اپنے عقیدہ کے مطابق کہا ، ہاں ۔ ان پر بھی ۔

انصاری کو غصہ آگیا ۔ اور اس یہودی کے ایک طمانچہ مار دیا ۔ یہودی نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی ۔ آپ نے فرمایا

لاتفضلونی علی الانبیاء مجھے دیگر پیغمبروں پر فضیلت نہ دیا کرو ۔

تمہیں کیا معلوم ہے کہ میرے بھائی موسیٰؑ کا کیا درجہ ہے سنو ! قیامت کے روز سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور سب سے پہلے حق تعالیٰ مجھے ہوش میں لائے گا ۔ اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ بے ہوش ہی نہیں کئے جائیں گے ، کیونکہ وہ دنیا میں دیدار الٰہی کے وقت بے ہوش ہو چکے ہیں ۔ یا بے ہوش تو کئے جائینگے مگر سب سے پہلے انہیں ہوش عطا کیا جائے گا ۔ (بخاری)

یہ مطلب نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واقعی تمام رسولوں سے افضل نہیں ہیں۔ بلکہ افضل تو ہیں ——— انا سید ولد آدم ولا فخر ——— لیکن محض رواداری اور اس مظلوم یہودی کی دل جوئی کرنے کی خاطر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متواضعانہ جملے استعمال فرمائے۔

اہل کتاب کی اسلام دشمنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس رواداری اور اظہار لطف ومدارات کا جو صلہ ان اہل کتاب نے اسلام کو دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے اسلام کو صفحۂ زمین سے مٹانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ کیونکہ اسلام انسانی محبت اور حسنِ اخلاق کا برتاؤ کرنے کو تو بہر صورت تیار ہے لیکن وہ اسے ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ کسی قوم کو بد اخلاقیاں پھیلانے اور ان پر برقرار رہنے کی آزادی دیدے، اور ان کا پردہ چاک نہ کرے ———

اور یہ بات ان اہل کتاب کے لئے ناقابلِ برداشت تھی اس لئے اسلام کے خلاف سازشیں کرنا اور اس کے وقار کو نقصان پہنچانا ان کا فرضِ اولین ہوگیا تھا۔ قرآن کریم نے ان کی ذہنیت کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم (سورہ بقرہ رکوع ۱۳)	اہل کتاب میں بہتری تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا دیں اس حسد کی وجہ سے جو ان کے اندر ہے۔

اس مضمون کی آیات سورۃ آل عمران رکوع دس ور رکوع سات وسورہ نساء رکوع سات میں بھی موجود ہیں۔

(۲) اسلام کو بدنام کرنے کے لئے بڑی بڑی گہری منافقانہ چالیں چلتے ہیں۔

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ (سورۃ آل عمران) رکوع ۸	اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ دیکھو مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لئے ایسا کرو کہ صبح ان کی کتاب پر ایمان لے آو، شام کو انکار کردو اس تدبیر سے امید ہے کہ وہ دوسروں کو پھرتا ہوا دیکھ کر اپنے دین سے پھر جائیں گے اور سچے دل سے اگر ماننا تو انہیں لوگوں کی بات ماننا جو تمہارے طریقہ پر آجائیں۔

(۳) مسلمانوں کی خوش حالی اور شوکت پر اہل کتاب دانت پیستے ہیں:-

هَاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ	سنو! تم تو ان اہلِ کتاب سے (اپنے بلند اخلاق
وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ	کی وجہ سے) محبت کا برتاؤ کرتے ہو مگر یہ لوگ
بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ وَاِذَا لَقُوْكُمْ	تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی دوست نہیں رکھتے
قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا	حالانکہ تم تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے
عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ	ہو۔ اور یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں۔ تو
قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ۔	(فریبکارانہ طور پر) کہتے ہیں۔ ہم بھی مومن
(آلِ عمران رکوع ۱۲)	ہیں یعنی اپنے مذہب پر ہمارا ایمان ہے

اور جب الگ ہوتے ہیں تو مارے غصہ کے اپنی پوٹیاں چباتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ تم لوگ اپنے آپ کو جوشِ غضب میں ہلاک کر دو۔

(۴) اہلِ کتاب کے "بڑے" اپنے آدمیوں سے کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کے ساتھ صرف زبانی ہمدردیاں رکھو۔ اور جو حقائق تم پر منکشف ہیں ان حقائق کی مسلمانوں کو ہوا تک نہ دو کیونکہ یہ خود تمہارے لئے مضر ہوگا۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا	اور جب اہلِ کتاب مسلمانوں سے ملتے ہیں
وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ	تو (از راہِ فریب) کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن
قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ	ہیں اور جب اکیلے میں ایک دوسرے سے
اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ	ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جو کچھ تم پر خدا نے

عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ - انکشاف کیا ہے وہ تم ان لوگوں پر کیوں
(سورہ بقرہ رکوع ۹) ظاہر کرتے ہو۔ کیا اس لئے کہ یہ لوگ
(دنیا میں اور خصوصاً) تمہارے رب کے پاس اس سے محبت پکڑیں
کیا تم لوگ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ؟

(۵) اہلِ کتاب بت پرست مشرکین کو مسلمانوں سے بہتر سمجھتے ہیں

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا اے نبی! کیا تم اہلِ کتاب کو نہیں دیکھتے
مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ کہ کس طرح وہ بتوں اور شریر قوتوں
وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ پر ایمان رکھتے ہیں اور مشرکین کی نسبت
كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ کہتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے کہیں
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (سورہ نساء ع) زیادہ راہِ راست پر ہیں -

(۶) اول تو یہ اہلِ کتاب اپنے سوا سب کو جاہل اور غیر مہذب سمجھتے ہیں - اور پھر یہ کہتے ہیں کہ ان جاہلوں کا مال مارنا اور انہیں ہر طرح لوٹنا ہمارا قدرتی حق ہے -

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ اور ان اہلِ کتاب میں وہ لوگ ہیں کہ اگر
لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھدو
عَلَيْهِ قَآئِمًا - ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا تو وہ کبھی تمہیں واپس نہ کریں جب تک
لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ہمیشہ ان کے سر پر نہ کھڑے رہو اس

(آل عمران) بدمعاملگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ ان غیر اہل کتاب کے بارے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

(۷) اگر ان اہل کتاب کو بادشاہت کا کوئی حصہ مل گیا تو یہ اور لوگوں کو بھوکا مار دیں گے۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ	کیا ان اہل کتاب کے پاس سلطنت کا
فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ	کوئی حصہ ہے۔ ایسی حالت میں تو یہ
نَقِيرًا (مائدہ)	لوگ اوروں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیں گے۔

(۸) یہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ اسے بجھاتا ہے۔

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ	یہ لوگ جب جب جنگ کی آگ بھڑکاتے
وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ	ہیں تو خدا تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے۔ اور
كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ	یہ لوگ زمین میں فساد پھیلانے کے لئے
أَطْفَأَهَا اللَّهُ وَيَسْعَوْنَ	دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں۔
فِي الْأَرْضِ فَسَادًا۔	(مائدہ)

(۹) وعدہ خلافی اور بدعہدی۔

أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ	جب کبھی ان لوگوں نے کوئی عہد کیا تو کسی نہ
فَرِيقٌ مِّنْهُم بَلْ أَكْثَرُهُمْ	کسی گروہ نے ضرور ہی اسے پس پشت ڈال دیا

لَا یُؤمِنُوْن ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے دل خداپرستی کے سچے ایمان سے خالی ہیں۔

(۱۰) یہ نام نہاد اہلِ کتاب بُت پرستوں سے بھی زیادہ اس فانی دنیا کی لذتوں کے حریص ہیں!

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۔ (سورہ لبقرہ رکوع ۱۱)

اے نبی! تم ان اہلِ کتاب کو مشرکین سے بھی زیادہ دُنیا کا حریص پاؤگے۔ ان میں اک اک آدمی یہ حسرت رکھتا ہے کہ کاش وہ ایک ہزار برس تک تو جیئے۔

اہلِ کتاب سے عدم تعاون

پس قرآن کہتا ہے کہ ان کینہ وروں اور حاسدوں، حق کے دشمنوں اور مادیت کے پجاریوں، متکبر اور رعونت پسندوں، ڈاکوؤں اور بدمعاملہ سفید بدمعاشوں، چالاکوں اور ظلم پروروں، مفسدوں اور لڑاکوؤں کے ساتھ دوستی اور ہمدردی نہ رکھو۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ

مسلمانو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ تو (تمہاری مخالفت میں) ایک دوسرے کے دوست مددگار ہیں اور (دیکھو) تم میں سے جو کوئی انہیں اپنا

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۔

رفیق و مددگار بنائے گا تو وہ انہی میں سے سمجھا جائے گا حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالے ظالموں پر ہدایت کی راہ نہیں کھولتا۔ پر (اے پیغمبر!) تم دیکھو گے کہ جن (مسلمانوں) کے دلوں میں (نفاق) کا روگ ہے وہ ان (اہل کتاب) کی طرف دوڑے جا رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ (کہیں ان با اقتدار اہل کتاب سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے) ہم کسی مصیبت کے پھیر میں نہ آ جائیں۔ تو (یقین کرو) وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ تم مسلمانوں کو فتح عنایت کرے گا۔ یا اس کی طرف سے (کامیابی کی) کوئی اور بات ظاہر ہو گی اور اس وقت یہ (منافق) لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے۔ جو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھی ہے۔

قبائل یہود کے خلاف سخت کارروائی

قبیلہ بنی قینقاع | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی اس ذہنیت کو ایک حد تک تو برداشت کیا

لیکن جب ان لوگوں نے کھلم کھلا عہد شکنیاں شروع کر دیں تو پھر حضور ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

چنانچہ قبیلہ بنی قینقاع وہ سب سے پہلا قبیلہ ہے جس نے عہد کے خلاف اقدام کیا۔ بدر کی لڑائی میں مختلف طریقوں سے شورش کی، اور جب ایک عورت کو چھیڑنے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سمجھانے تشریف لے گئے۔ تو آستینیں چڑھا کر لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

۱۵ روز تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا بالآخر یہ لوگ اس پر رضامند ہو گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے۔ وہ انہیں قابل قبول ہوگا۔ عبداللہ ابن ابی نے یہ دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی کہ انہیں جلاوطن کر دیا جائے آپ نے اسے منظور کر لیا۔ اور چھ سو کے قریب افراد مدینہ کے اطراف سے اذرعات (شام) میں چلے گئے۔ یہ واقعہ شوال ۲ھ کا ہے۔

قبیلہ بنو نظیر

بنی قینقاع کے بعد بنی نظیر نے عہد توڑا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اوپر سے پتھر گرا کر شہید کرنے کی سازش کی۔ خدا نے بروقت اپنے نبی کو مطلع کر دیا۔ اور آپ اس سے بال بال بچ گئے۔ اس کے بعد آپ نے ان لوگوں سے معاہدہ کی تجدید کے لئے کہا۔ مگر یہ نہ مانے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

۴ھ ربیع الاول میں ان کی سرکشی کے باعث جلا وطن کر دیا اور یہ اجازت دیدی کہ جس قدر مال اونٹوں پر لادھ سکیں لادھ کرلے جائیں یہ لوگ مدینہ سے خیبر چلے گئے۔

قبیلہ بنی قریظہ اس قبیلہ نے اسلام کے خلاف ایک زبردست مورچہ قائم کیا جس میں عرب کے تمام دشمن اسلام قبائل شریک ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے دس ہزار مسلح عربوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو کامیاب کیا۔ اور ان کی سازش ناکام ہوئی۔ اس غزوہ کا نام غزوہ خندق ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق میں فتح پانے کے بعد بنی قریظہ کی طرف رخ کیا۔ جو اس لڑائی کے بانی مبانی تھے۔ اور ۲۵ روز تک ان کے قلعوں کا محاصرہ جاری رکھا۔ اور بنی قریظہ نے مجبور ہو کر بلا شرط ہتھیار ڈالدیئے۔ آپ نے حضرت سعد ابن عبادہ کو یہود کی مرضی سے فیصلہ کا اختیار دیدیا۔ حضرت سعد نے اس قبیلہ کی سنگین عہد شکنی اور اسلام دشمنی کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ عورتوں کے علاوہ تمام جوانوں کو قتل کر دیا جائے۔ قتل ہونے والوں کی تعداد چھ سو اور سات سو کے درمیان تھی۔

یہود کے ان بڑے بڑے قبیلوں کا اس طرح استیصال ہوا کہ بغیر اسکے عرب کی سرزمین پر اخلاق و تہذیب کا بار آور ہونا مشکل تھا اس کے

بعد مدینہ کے اطراف میں یہود کی کوئی بڑی جماعت باقی نہ رہی۔ البتہ وہ یہودی باقی رہے۔ جو مختلف قبائل میں منتشر تھے۔

خیبر کی فتح

خیبر یہودی طاقت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اور جب سے بنی نظیر مدینہ سے جلاوطن ہو کر یہاں آئے تھے۔ اس وقت سے یہاں رات دن اسلام کے خلاف حملہ کرنے کی سکیمیں سوچی جاتی تھیں۔

یہ لوگ ادھر تو قبیلہ غطفان سے جو خیبر کے قریب آباد تھا۔ اور عرب کا بڑا با اثر قبیلہ تھا اسلام کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے۔ ادھر عبداللہ ابن ابی انہیں اکسا رہا تھا کہ مدینہ کے مٹھی بھر مسلمانوں سے کیا ڈرنا جب تم چاہو گے انہیں ختم کر دو گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں سے معاہدہ کر کے اس قسم کے قصوں کو ختم کرنا چاہا۔ مگر یہ لوگ تیار نہ ہوئے۔ تب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم ۷ھ کو خیبر کی طرف کوچ کیا اور سخت مقابلہ کے بعد فتح پائی۔ اور پیداوار کے نصف حصہ ادا کرنے کی شرط پر ان کی زمین ان کے حوالہ کر کے واپس تشریف لے آئے۔

اہل خیبر کی جلاوطنی

اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو کامل امن و امان اور ہر طرح کی مراعات بخشیں

مگر اسلام کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مفسدانہ رہا۔

ایک یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا۔ مگر آپ نے اُسے معاف کر دیا۔ حضرت عبداللہ ابن سہل کو قتل کر دیا۔ مگر حضور ؐ نے ان سے تعرض نہ کیا۔ اور بیت المال سے مقتول کا خوں بہا ادا کیا۔ ——— یہ فساد انگیزیاں برابر جاری رہیں۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضؓ کے عہد میں بہت بڑھ گئیں۔

ایک روز عبداللہ ابن عمر کو یہودیوں نے کوٹھے کے اوپر سے پھینک دیا۔ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا۔ مجبور ہو کر حضرت عمر رضؓ نے یہود خیبر کو شام کے اضلاع میں جلا وطن کر دیا۔ ——— یہود کی اسی فساد انگیز طبیعت کے پیش نظر فتح خیبر کے وقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ دیا تھا۔ کہ ہم جس وقت مناسب سمجھیں گے تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ حضرت عمر رضؓ نے اپنے نبیؐ کی آخری وصیت پر عمل کرتے ہوئے ان لوگوں کو خیبر سے باہر کر دیا۔ اور ان کی زمینوں کی قیمت دیدی

نجران کے عیسائی اور ان کی جلاوطنی

یمن اور اس کے اطراف میں نجران کے عیسائی آباد تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں انہیں آزادی کے

ساتھ رہنے سہنے کا موقع دے رکھا تھا مگر جب ان لوگوں نے عہد فاروقی میں چپکے چپکے جنگ کی تیاریاں شروع کیں اور گھوڑے اور ہتھیار جمع کرنے شروع کر دیئے تو حضرت عمرؓ نے اس فساد کو روکنے کی غرض سے انہیں حکم دیا کہ یہ لوگ عراق چلے جائیں، اور عراق و شام کے افسران کو لکھ بھیجا کہ انہیں رہنے سہنے اور زراعت کے لئے مفت زمینیں دی جائیں اور ۲۴ مہینے تک ان سے جزیہ وصول نہ کیا جائے

عیسائی قوت سے مقابلہ کا آغاز

غزوہ موتہ

رومی سلطنت سے اسلام کے مقابلہ کا آغاز غزوہ موتہ سے شروع ہوتا ہے، یہ غزوہ اس بناء پر برپا ہوا تھا کہ شرجیل ابن عمرو نے اسلام کے قاصد حضرت حارث کو شہید کر دیا تھا، حارثؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ گرامی لے کر قیصر روم کے پاس گئے تھے، شرجیل نے انہیں شہید کر دیا، یہ بلقاء کا والی اور قیصر کے ماتحت تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بین الاقوامی جرم کا قصاص لینے کی غرض سے حضرت زیدؓ کی قیادت میں جمادی الاولیٰ ۸ھ میں تین ہزار مسلمانوں کا ایک لشکر روانہ کیا، جاسوسوں نے

شرجیل کو اطلاع ہوئی، شرجیل نے ایک لاکھ عیسائیوں کی فوج تیار کی۔ اور قیصر روم بھی قبائل عرب کی بے شمار فوج لے کر صف آرا ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ مسلمان جو اس قدر تھوڑی تعداد میں تھے اس لشکر جرار کے مقابلہ میں کیسے کامیاب ہو سکتے تھے۔ بڑی ہمت سے لڑے۔ بالآخر حضرت خالد ابن ولیدؓ بڑی ہوشیاری سے اسلامی فوج کو دشمن کی زد سے بچا لائے۔

غزوۂ تبوک

اس کے بعد رجب ۹ھ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کے مشہور مقام تبوک پر تیس ہزار فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ کیونکہ یہ افواہیں گرم تھیں کہ قیصر مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے، مگر جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ حملہ کی خبر غلط تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں بیس روز تک قیام کیا، اس اثناء میں ایلہ (جو خلیج عقبہ کے پاس ہے) کا سردار یوحنا حاضر خدمت ہوا اور جزیہ دینا منظور کر لیا، اس کے علاوہ چند اور مقامات کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی۔

دومۃ الجندل کا عربی سردار اکیدر نامی قیصر کے ماتحت تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضؓ کو چار سو سواروں کے ساتھ اس کے مقابلے کے لئے بھیجا، خالد رضؓ نے اسے گرفتار کر لیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ یہ خود مدینہ میں آکر شرائط صلح پیش کرے، چنانچہ یہ اپنے بھائی کے ساتھ آیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امان دی۔

عہد نبوی میں آخری لشکر

سب سے آخری لشکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ ابن زید رضؓ کی قیادت میں غزوۂ موتہ کے مظلوم مسلمانوں کے قصاص کے لئے مرتب کیا تھا مگر چونکہ آپ مرض وفات میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے یہ روانہ نہ ہو سکا،

مصر اور شام میں عیسائی طاقت کا زوال

عیسائی اور یہودی قوموں کی اسلام دشمنی [illegible] جابرانہ طاقت کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ [illegible] ہی میں یہ مہم شروع ہو چکی تھی۔ مگر چونکہ آپ کو [illegible] نے [illegible] اس لئے یہ اہم کام باقی رہ گیا۔ اس بنا پر [illegible] نے

زندگی کے آخری لمحات میں اس کی جانب توجہ دلاتے ہوئے صحابۂ کرام رضؓ کو وصیت کی۔

"——عرب کی سرزمین سے عیسائیت اور یہودیت کا اقتدار ختم کر دینا——"

چنانچہ عہدِ فاروقی میں اس وصیت کی تعمیل پوری ہوئی، اور مصر اور شام پر اسلام کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ جو عیسائی تہذیب کے سب سے بڑے مرکز تھے۔

دنیا جانتی ہے کہ اسلامی فتوحات کا یہ اہم باب حضرت عمر رضؓ کی دانشمندانہ اور شجاعانہ روایات خلافت ہی سے تصنیف ہوا ہے۔ "رضی اللہ عنہ، وعنہم اجمعین"۔

حیات النبیؐ

علماء محققین کا مذہب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق——بلکہ تمام پیغمبروں کے متعلق——اہلِ سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔

یہ عقیدہ بظاہر بہت سادہ ہے لیکن درحقیقت اس کی تفصیلی حقیقت کا سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

محققین اہل سنت نے اس عقیدہ کی توجیہ میں صرف اتنا کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو برزخ کے عالم میں نہایت ممتاز زندگی حاصل ہے اور ان حضرات کے قالب ان کی قبروں میں محفوظ ہیں۔

لیکن اس پر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ برزخ میں تو سب ہی کو حیات حاصل ہوتی ہے۔ شہداء کے متعلق تو قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل	جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کردیئے گئے ہوں
اللہ اموات بل احیاء	انہیں مردہ مت کہو، وہ تو زندہ ہیں اور اپنے
عند ربھم یرزقون فرحین	رب کے پاس روزی دیئے جاتے ہیں خوش وخرم ہیں

صرف یہی نہیں کہ شہداء ہی زندہ ہیں بلکہ عام مومنین اور کفار بھی زندہ ہیں۔ موت تو نام ہے صرف اس کا کہ روح انسانی، جسم سے مفارقت اختیار کر لیتی ہے۔ جسم مٹی میں مل جاتا ہے یعنی عناصر اربعہ کا مرکب عناصر اربعہ میں مخلوط ہو جاتا ہے۔

روحیں زندہ رہتی ہیں۔ اہل ایمان کی اعلیٰ علیین میں اور کفار کی سجین میں ——— پھر حیات انبیاء کی کیا تخصیص ہے ———؟

اس کے جواب میں علماء محققین نے یہ کہا ہے کہ نفس زندگی میں گو سب برابر ہیں۔ مگر انبیاء علیہم السلام کو جیسی خاص اور ممتاز زندگی حاصل

ہے وہ دوسروں کو میسر نہیں۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو کہ انبیاء کی برزخی زندگی کے مقابلہ میں تمام زندگیاں گویا کہ موت ہیں اور ناقابلِ ذکر ہیں۔

اس امتیاز کی کیفیت کیا ہے؟ ـــــ یہ بات اس عالم میں ہمارے ادراک میں نہیں سما سکتی۔ عالمِ برزخ کے قوانین عالمِ مادی کے قوانین سے بالکل مختلف ہیں۔ انہی قوانین کے ماتحت انبیاءؑ کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے۔

امتیاز کی پہلی صورت

اس امتیاز کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انبیاءؑ کی روحوں کو عالمِ برزخ میں جو نورانی قالب عنایت کئے جاتے ہیں۔ وہ کسی کو میسر نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ قالب ان کی نیکیوں اور حسنِ عمل کی تمثال ہیں۔ پس جس طرح انبیاء اپنے اعمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتے اسی طرح برزخی قالب میں بھی کوئی دوسرا شخص ان کی نظیر نہیں ہو سکتا ـــــ خصوصاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ آپ چونکہ تمام کائناتِ ہستی کے اعلیٰ اور بے مثال فرد ہیں اس لئے آپ کی برزخی زندگی بھی سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔

امتیاز کی دوسری صورت

دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان حضرات کے مادی قالب زمین میں محفوظ و محترم رہتے ہیں۔ بخلاف شہداء وغیرہ کے کہ ان کے اجسام کا زمین میں محفوظ رہنا ضروری نہیں۔ چنانچہ حضرت اوس ابن اوس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ

قال قال رسول اللہ صلی اللہ — اوس کہتے ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ جمعہ کا
علیہ وسلم ان من افضل — دن بہترین دن ہے۔ تم جمعہ کے دن مجھ پر کثرت
ایامکم یوم الجمعة فاکثروا — سے درود بھیجا کرو۔ کیونکہ تمہارے درود مجھ پر
علیّ من الصلوٰة فیہ فان — پیش کیے جاتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا
صلوٰتکم معروضة علیّ فقالوا — حضور! جب جناب کا جسم بوسیدہ ہو جائیگا
یارسول اللہ وکیف تعرض — اس وقت ہمارے درود آپ کے سامنے کس
صلاتنا علیک وقد ارمت — طرح پیش کیے جائیں گے؟ ــــ حضورؐ نے
قال ان اللہ حرم علی الارض — فرمایا۔ خدا تعالیٰ نے انبیاء کے جسموں کو
اجساد الانبیاء۔ (ابوداؤد۔ — زمین پر حرام کر دیا ہے۔

نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارمی۔ طبرانی۔ بیہقی۔ احمد۔ ابن ابی شیبہ۔ ابن خزیمہ۔ ابن حبان۔ حاکم۔ قال النووی فی الاذکار اسنادہ صحیح)

تیسری صورت یہ امتیاز بھی ہو سکتا ہے کہ انبیاء برزخ کی زندگی میں ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ ــــــ

اور یہی ان کی روحانی غذا ہے۔

عن انس ابن مالک عن النبیؐ قال الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔ — حضورؐ نے فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام قبروں میں زندہ ہوتے ہیں وہاں ان کا مشغلہ ذکر و نماز ہے۔

(رواہ ابو یعلی الموصلی۔ قال العسقلانی فی فتح الباری رواتہ ثقات)

لیکن یاد رکھئے کہ روایت میں "قبور" سے مراد اصطلاحی قبور ہیں یعنی عالم برزخ کے مقامات ــــــــ

مطلب یہ ہے کہ انبیاء برزخی زندگی میں ذکر و نماز میں ایسے مشغول رہتے ہیں اور انہیں اس ذکر میں وہ لذت و سرور حاصل ہوتا ہے جو مشغولیت اور سرور دوسروں کو میسر نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ حضورؐ نے شب معراج کے واقعات کے سلسلہ میں فرمایا۔

"میں جب موسیٰؑ کی قبر سے گزرا تو آپ کو نماز میں مشغول دیکھا۔" (مسلم)

اس کا مطلب بھی یہی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کو شب معراج میں یہ دکھایا گیا کہ حضرت موسیٰؑ عالم روحانیات میں ذکر و نماز میں مشغول ہیں۔

دنیا کی زندگی پر نظر ڈالیئے۔ ایک زندگی ان لوگوں کی ہے جنہیں نہ ڈھنگ کا کپڑا ملتا ہے نہ پیٹ بھر کے روٹی۔ زندگی اسے بھی کہتے ہیں۔

ایک زندگی امیروں اور بادشاہوں کی ہے کہ مادی عیش و آرام میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہوتا ــــــ اس زندگی کے مقابلہ میں غریب کہتے ہیں کہ:۔

"میاں ہماری زندگی کیا۔ ہم تو مردوں سے بدتر ہیں۔"

بس یہی صورت عالم روحانیات کی ہے۔ اس عالم میں زندگی کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا دارومدار روحانی ارتقاء اور روحانی مراتب پر ہے جس کو جتنی زیادہ روحانی ترقی نصیب ہوگی وہ برزخی زندگی میں اتنا ہی زیادہ کامیاب سمجھا جائے گا۔

انبیاء روحانی عالم کے شہنشاہ ہیں جن کے مقابلہ میں ہر روحانی ترقی ناقابلِ ذکر ہے۔ اور ہر روحانیت نفی کے درجہ میں ہے ——— پھر اس عالم میں انہیں بھی وہ امتیاز حاصل نہ ہوگا تو اور کس کو ہوگا ہم بیان نہ کر سکیں تو یہ ہمارے شعور و ادراک اور ذریعہ بیان کی کوتاہی اور قصور ہے ———

انبیاء علیہ السلام کی برزخی زندگی تو درکنار خدا تعالےٰ نے تو شہداء کے متعلق فرمایا ہے۔

بل احیاء و لکن لا تشعرون۔	وہ زندہ ضرور ہیں۔ لیکن تم ان کی زندگی کا صحیح شعور نہیں کر سکتے۔

حالانکہ انبیاء اور شہداء کے درمیان ایک درجہ اور بھی ہے "صدیقین" کا۔ یہ لوگ شہداء سے اعلیٰ مراتب رکھتے ہیں۔ اور قرآن نے انبیاء کے بعد انہی کا درجہ بیان کیا ہے۔ من النبیین والصدیقین و الشہداء والصالحین۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ شہداء کی برزخی زندگی کی امتیازی شان سمجھانے کی غرض سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیرایۂ بیان اختیار فرمایا ہے وہ برزخی اجسام کی امتیازی کیفیت کو قریب الفہم کرنے کا سب سے زیادہ موثر اور آسان طریقہ ہے ——— فرمایا۔ "شہداء کی روحیں جنت کے سبز پرندوں کے پوٹوں میں رکھی جاتی ہے۔ اور وہ آزادی کے ساتھ جنت کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔"

اس تعبیر واستعارہ میں دو چیزیں بیان فرمادیں۔ شہداء کو اعلیٰ سے اعلیٰ قالب عنایت فرمائے جاتے ہیں، کیونکہ جنت جیسے ارفع مقام کے سبز پرندے جوشن وقندیل رکھتے ہونگے وہ ظاہر ہے۔

دوسری بات یہ کہ پرندوں کی تیز رفتاری نے شہداء کی روحانی ترقی اور روحانی مسرتوں میں کامل آزادی بیان فرمادی۔

بتایئے۔ جب یہ تیسرے درجہ کے مقربین کے لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہو اس شرف وامتیاز کو قریب الفہم کردیا جائے تو اعلیٰ قسم کے مقربین کے لئے کونسی تعبیر اختیار کی جائے ـــــ پس اسی پر قیاس کرکے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

ایک شبہ کا ازالہ حیات النبی ؐ کے متعلق ایک حدیث کا مطلب اور سمجھنے کے لئے حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں۔

قال قال رسول اللہ ما من احد یسلم علیّ الا رد اللہ روحی حتی ارد علیہ السلام	جب کوئی مسلمان مجھ پر سلام بھیجے گا تو خدا تعالیٰ میری روح کو لوٹا دے گا، یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دوں۔

(ابوداؤد۔ احمد۔ نووی نے اذکار میں اس کو صحیح کہا ہے)۔

اس حدیث کی بنا پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حیات سے عاری ہیں، اور آپ کی روح آپ کے جسم سے الگ رہتی ہے۔ صرف اس وقت داخل ہوتی ہے جب کوئی مسلمان آپ پر درود بھیجتا ہے۔ اگر یہی صورت ہے تو پھر اسے حیات سے کیا تعلق۔؟

شاہ عبدالحق کا جواب حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ "اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ حضورؐ کی روح جسم سے الگ رہتی ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی روح ہمیشہ مشاہدہ الٰہی میں مستغرق رہتی ہے۔ جب کوئی مسلمان درود بھیجتا ہے تو آپ کی روح کو افاقہ دے کر اس عالم کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے تاکہ آپ اس کا جواب دعاء و استغفار کے ساتھ دے سکیں ——— اسی صورت حال کو اس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ جو حدیث بالا میں مذکور ہے"

لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ پھر تو کسی وقت بھی آپ کی روح کو استغراق مشاہدہ کا موقعہ نہ ملتا ہوگا۔ کیونکہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ حضورؐ پر درود و سلام نہ بھیجا جاتا ہو۔ حق بات یہ ہے کہ اس اشکال کے جواب میں وہی طرزِ استدلال اختیار کرنا مناسب ہے۔ جو علامہ سخاویؒ نے اختیار کیا ہے۔

امام سخاوی کا جواب

امام سخاوی کہتے ہیں: عالم برزخ اور عالم قیامت کے احوال ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ ہیں پس جس طرح ہم عالم دنیا میں بیٹھ کر عالم آخرت کے حالات و کوائف کی صحیح تعیین نہیں کر سکتے۔ اسی طرح عالم برزخ کی صحیح کیفیت بھی نہیں سمجھ سکتے ——— یہی سلامت روی ہے کہ ناقابلِ فہم حقائق پر مجملاً ایمان رکھ کر اس کی تفصیل کو خدا کے حوالہ کر دیا جائے۔

زاد المعاد میں حافظ ابن قیم کا جواب

معراج کے حالات سے بحث کرتے ہوئے حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں ضمناً اس مسئلہ پر جن الفاظ میں روشنی ڈالی ہے وہ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ "اس کی گرہ یوں کھلتی ہے کہ وہاں آسمان پر

جو موسیٰ کو آپ نے دیکھا تو وہ اُن کی روح کا مقام مستقر تھا۔ اور قبر اُن کے جسم کا جہاں وہ قیامت میں روحوں کے لوٹانے کے وقت تک رہے گا اسی طرح آپ نے ان کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا اور چھٹے آسمان پر بھی دیکھا جس طرح وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بلند تر مقام یعنی "رفیق اعلیٰ" میں بھی قرار گیر ہیں۔ اور جسم مبارک قبر شریف میں بھی موجود ہے، جب سلام کرنے والا آپ پر سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو واپس کرتا ہے۔ تا آنکہ آپ جواب دیتے ہیں۔ حالانکہ مقام رفیق اعلیٰ سے آپ علیحدہ نہیں ہوئے۔ جو موٹی طبیعت کا آدمی اس مطلب کو نہ سمجھ سکے اس کو چاہیے کہ آفتاب کی طرف دیکھے کہ اس کی دوری اور بلندی کے باوجود اس کا تعلق زمین سے قائم ہے اور اس کے اندر وہ اثر ڈالتا ہے اور نباتات اور حیوانات کی زندگی میں اس کو دخل ہے۔ پھر روح کا مرتبہ تو اس سے بدرجہا زیادہ ہے کیونکہ روح کا معاملہ اور ہے اور جسم کا معاملہ اور ہے۔ دیکھو۔ آگ اپنی جگہ پر رہتی ہے۔ اور اس کی گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے روح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی زیادہ قوی اور کامل ہے اس لئے کہ روح آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہے۔

[illegible] ان تری سنا الشمس ان استغنت ظلام اللیالیا

گرد آلود آنکھوں [illegible] آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں کہ انہیں راتوں کی تاریکی نے چھا لیا ہے

(ازالہ اوہام جلد اول صفحہ ۳۰۲)